www.urducouncil.nic.in
قیمت: -/10₹

آدھی آبادی کے جذبات و احساسات کا ترجمان

ماہنامہ

خواتین دنیا

Mahnama Khawateen Duniya Monthly , New Delhi

جنوری 2023

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ
بچوں کی دنیا
دہلی
Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

پیاری پیاری نظمیں
دلچسپ کہانیاں
سائنس و ٹیکنالوجی

معلوماتی مضامین
صحتِ اطفال
بچّوں کا کتب خانہ

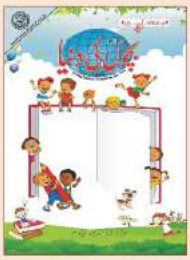

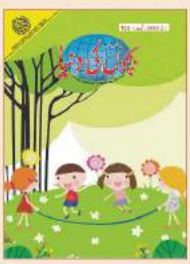

ان کے علاوہ:

کہکشاں ◆ زبان شناسی

میرا بچپن ◆ بچوں کے بڑے ادیب

بچوں کی پینٹنگ ◆ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

سب سے زیادہ چھپنے والا بچّوں کا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ: 10 روپے   سالانہ: 100 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

زرِتعاون سالانہ 100 روپے بنام NCPUL اکاؤنٹ نمبر: A/C: 90092010045326، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail: magazines@ncpul.in

شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون: 24415194 - 040

آدھی آبادی کے جذبات و احساسات کا ترجمان

ماہنامہ خواتین دنیا

Mahnama Khawateen Duniya Monthly , New Delhi

جلد: 7 شمارہ: 1 جنوری 2023

مدیر اعلیٰ : ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

مدیر منتظم : ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی

معاون مدیر : ڈاکٹر مسرت

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان

وزارت تعلیم، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

مطبع: ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا

فیز-II، نئی دہلی۔ 110020

مقامِ اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

قیمت -/10 روپے، سالانہ -/100 روپے

صفحات: 64 Total Pages

■ قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل (NCPUL) اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں

● ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر

فروغِ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا

جسولہ، نئی دہلی-110025، فون: 49539000

نگارشات ارسال کرنے کے لیے

ای میل: kduniya@ncpul.in

editor@ncpul.in

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر کے پورم، نئی دہلی۔ 110066

فون: 26109746، فیکس: 26108159

ای میل: sales@ncpul.in

شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس

بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002

فون: 24415194 - 040

اس شمارے میں

اداریہ		
مشعل	مدیر	4
شخصیت		
شمیم نکہت کے افسانوں میں عورت کے مسائل	شائستہ عالم	5
نکہتِ سخن		
شاعرات کے منتخب اشعار		9
جہانِ نسواں		
"کسی دن" کا ایک یادگار کردار	ڈاکٹر شبنم رضوی	10
ڈاکٹر شہناز فاطمی کی تخلیقات میں احساسات کی تابانی	ڈاکٹر منصور خوشتر	13
شائستہ بیگم سہروردی کی افسانہ نگاری	ڈاکٹر نغمہ نگار	16
پروفیسر اشرف جہاں کے افسانوں میں انسان دوستی	ڈاکٹر گلشن آرا	22
عصمت چغتائی کی مکتوب نگاری	ڈاکٹر محمد یونس ٹھوکر	26
محقق کے فرائض اور اوصاف	زرین فاطمہ	30
اعتراف ہنر		
بارہ قباؤں کی سہیلی عذرا پروین	جبیں نازاں	34
زبان و تعلیم		
آن لائن تعلیم: حال اور مستقبل	ڈاکٹر تسنیم بانو	38
حسنِ سخن		
ڈاکٹر ریشا قمر، سنجیدہ بانو، حفصہ انصاری		42
افسانہ		
چوتھا نکاح	احساس نایاب	44
نئی صبح	صائمہ پروین شمیم	48
وہ جورہ گیا	شکیلہ نگار	51
صحت		
سن یاس خواتین کی زندگی کا ایک اہم حصہ	ڈاکٹر احسان رؤف	54
قارئین کے خطوط		
مراسلہ		57
خواتین خبرنامہ		59

مشعل

گزشتہ سال گزرنے کے بعد نئے سال کی آمد پر ہم سب کچھ نئے عزائم اور نئے مقاصد کے ساتھ نئے سال کا آغاز کر رہے ہیں۔ایک دفعہ پھر ہم سب نئے جذبات، نئے احساسات، نئی امنگوں کے ساتھ نئے سال میں داخل ہو رہے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ یہ سال ہمارے لیے خوشگوار سال ثابت ہوگا اور ہم مختلف منزلوں کو عبور کرتے ہوئے اپنے اہداف اور مقاصد کی تکمیل کریں گے۔
'قارئین خواتین دنیا' کو نئے سال کی ڈھیروں مبارکباد اور نیک خواہشات!

نئے سال کو خوش آمدید کہتے ہوئے ہمارے دلوں میں کچھ نئے جذبات اور مقاصد ہوتے ہیں۔ان پر ہم پوری ایمانداری اور تہہ داری سے عمل پیرا ہوتے ہیں اور اپنے مقاصد کی تکمیل میں ہمیشہ مصروف عمل رہتے ہیں۔ہمارے دلوں میں کچھ نئے مقاصد سال نو کی آمد سے قبل ہی ابھرنے لگتے ہیں۔ہم نئے جذبوں کے ساتھ ان مقاصد پر عمل پیرا ہونے کا ہدف اپنے دل میں پیدا کرتے ہیں اور پوری ایمانداری سے اپنے مقاصد کی تکمیل میں لگ جاتے ہیں۔خوش قسمت ہوتے ہیں وہ لوگ جو اپنے جوش وجذبے کو سرد نہیں ہونے دیتے اور آنے والے کل کے لیے پوری طرح کمر بستہ رہتے ہیں۔اپنے مقاصد کی تکمیل میں دن رات ایک کر دیتے ہیں لیکن کچھ افراد ایسے بھی ہوتے ہیں جو اپنی ڈگر سے ہٹ جاتے ہیں اور راستہ بھٹک کر اپنی منزل کو بھول جاتے ہیں۔ظاہر ہے ایسے لوگوں کو کامیابی نہیں ملتی اور ناکامی ان کا مقدر بنتی ہے۔اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم جو خواب سال نو میں دیکھتے ہیں ان پر پوری طرح قائم ودائم رہیں اور جو طریق کار ہم نے اپنایا ہے اس پر عمل پیرا ہونے کی کوشش کریں۔وقت کے تقاضے کو ذہن میں رکھتے ہوئے ہمیں اپنے اہداف پر پوری ایمانداری اور محنت سے نظر مرکوز کرنی چاہیے تبھی ہم ان کو شرمندۂ تعبیر کر سکتے ہیں۔اس نئے سال کا آغاز کرتے ہوئے ہمیں اپنے ذاتی مقاصد کے ساتھ ساتھ ان مقاصد پر بھی غور کرنا ہوگا جو زبان وادب سے جڑے ہوئے ہیں۔اردو زبان کے فروغ کے لیے بھی لائحہ عمل اور منصوبہ بندی کرنی ہوگی تاکہ اردو زبان کا مستقبل تابناک ہو سکے۔اس پہلو پر بھی غور کرنا ہوگا کہ ہم اردو زبان کا تحفظ کیسے کر سکتے ہیں۔زبان ہمارے لیے اہمیت کی حامل ہوتی ہے۔زبان کی تشکیل، ارتقا اور اس کی مقبولیت اس بات کی شاہد ہوتی ہے کہ اہل نظر اور اہل ادب اردو زبان کے فروغ کے لیے سنجیدہ ہیں اور زبان کی ترقی چاہتے ہیں۔ہمیں کتابوں سے رشتہ جوڑنا ہوگا اور اپنے بچوں کو اردو زبان کی طرف راغب کرنا ہوگا۔اردو پڑھنے، لکھنے اور بولنے والوں کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ ایسے افراد کو جو اردو پڑھنا لکھنا نہیں جانتے ان کو اپنی طرف متوجہ کریں۔اردو زبان سے نابلد افراد میں اردو زبان کا ذوق وشوق پیدا کریں۔اپنے اردگرد ایسا ماحول تیار کریں جو اردو زبان وادب کی تشکیل میں معاون ہو۔

آپ کا

عقیل احمد

ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

شائستہ عالم

شمیم نکہت کے افسانوں میں عورت کے مسائل

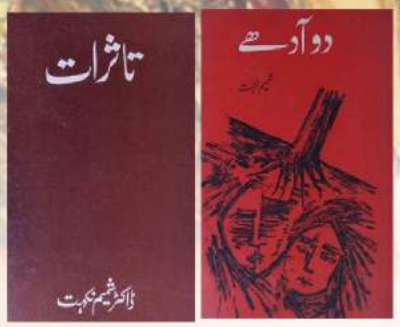

خواتین افسانہ نگاروں میں شمیم نکہت ایک اہم نام ہے وہ ترقی پسند نظریات کی حامل تھیں جس کے نمایاں اثرات ان کے یہاں موجود ہیں انھوں نے ہندو، مسلم، سکھ تینوں معاشرے کو اپنے افسانوں کا موضوع بنا کر پیش کیا ہے اور بحیثیت خاتون افسانہ نگار کے انھوں نے عورتوں کے مسائل کو اپنی ترجیحات میں شامل کیا ہے۔

شمیم نکہت کی ولادت 1935 میں لکھنؤ کے ایک ایسے خاندان میں ہوئی جہاں لڑکیوں کی تعلیم کا کوئی رواج نہ تھا بجز قرآن اور ابتدائی چند جماعت کے انھیں اس نئی ایجاد سے دور رکھا جاتا تھا مگر شمیم نکہت کی والدہ فہمیدہ خاتون نے ان کے لیے کچھ اور ہی خواب دیکھے تھے۔ جس کے تحت وہ اپنے خاندان کی پہلی ایسی خاتون بنیں جس نے بغیر کسی رکاوٹ کے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ کرامت حسین گرلز کالج سے انھوں نے بی۔ اے کیا جہاں مس روشن جہاں اور رضیہ سجاد ظہیر جیسی اساتذہ نے ان کی ذہنی تربیت میں اہم رول ادا کیا۔ 1959 میں لکھنؤ یونیورسٹی سے ایم۔ اے اور 1963 میں احتشام حسین کی زیر نگرانی پریم چند کے ناولوں میں نسوانی کردار کے موضوع پر پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ 1963 میں ہی ان کا تقرر دہلی یونیورسٹی میں بحیثیت عارضی لکچرر کے عمل میں آیا جہاں وہ مختلف عہدوں سے ہوتے ہوئے صدر شعبۂ اردو کی حیثیت سے 2000 میں سبکدوش ہوئیں۔ زندگی کی ان تمام منازل کو عبور کرتے ہوئے شارب ردولوی جیسے شریک سفر کے ساتھ انھوں نے ہر مقام پر ان کی رہنمائی کے ساتھ حوصلہ افزائی کر کے ان کی راہوں کو مزید ہموار کیا۔ اپنی علمی و تدریسی مصروفیات کے سبب شمیم نکہت نے زیادہ نہیں لکھا ایک تنقیدی مضامین کے مجموعے 'تاثرات' کے علاوہ ایک افسانوی مجموعہ 'دو آدھے' اور چند متفرقات ان سے یادگار ہے مگر یہ قلیل سرمایہ بھی ان کے نام کو اہمیت و انفرادیت عطا کرنے کے لیے کافی ہے۔

شمیم نکہت نے یوں تو تمام قسم کے موضوعات کو اپنے دائرۂ کار میں شامل کیا ہے مگر حقوق نسواں کے گوشے پر بطو خاص توجہ مرکوز کی ہے۔ عورتوں کے حقوق کے متعلق لکھتے وقت وہ کسی بے راہ روی کا شکار نہیں ہوتیں اور نہ ہی فریق مخالف کو یکسر نظر انداز کرتیں ہیں۔ مگر عورتوں کی حق تلفی واستحصال زدگی انھیں حد درجہ بیقرار کر جاتی ہے اور یہ بیقراری جزبۂ ہمدردی کے ساتھ مل کر جذبات میں پور پور ڈوبی کہانیاں خلق کرتی ہیں ایسی کہانی جس کے حرف حرف سے لہو ٹپکتا ہے۔

افسانہ 'انصاف ایک ایسی عورت کی کہانی ہے جس کی ازدواجی

زندگی اس دوراہے پر آ گئی تھی جہاں سے یا تو وہ اپنے وجود کی نفی کر کے ''عورت تو ہے ہی کمتر'' جیسے زہر آلود تیر اپنی ذات میں سمو لے یا پھر اپنے وجود کی اہمیت کو تقویت عطا کرتے ہوئے ان تیروں کا رخ مخالف سمت موڑ دے۔ جب اختلافات کا عفریت قوی تر ہو گیا تو ان دونوں نے علیحدہ راہیں اختیار کرنا مناسب سمجھا۔ ایک ننھا 'راحت' ہی تھا جو اس کی تاریک زندگی کا روشن ستارہ تھا اور جسے عدالت نے اس کی تحویل میں دے دیا مگر صرف پانچ سال تک کیونکہ ان قانون کے محافظوں کو بھی علم ہے کہ اس عرصے میں اسے مال و دولت کی نہیں اس کے جسم اور ممتا کی ضرورت ہے جو صرف وہی پوری کر سکتی ہے۔ راحت کی پرورش و پرداخت میں کوئی کمی نہ رہ جائے اس لیے اس نے اپنی جانب بڑھنے والے ان تمام قدموں کو روک دیا جس کا راستہ دل تک جاتا ہے اور اب جب پانچ سال کا وقفہ گزر گیا اور اپنی ذات کو فراموش کر کے اس نے جس راحت کی کفالت کی وہ اب قانوناً اپنے باپ کی ملکیت تھا۔ راحت سے جدا ہونے کا تصور ہی اس کے باطن میں ہلچل پیدا کر کے طوفان کی صورت اختیار کر رہا تھا، وہ رات جس کی اگلی صبح اس فیصلے کا انجام تک پہنچنا تھا اس کی زندگی کی مشکل ترین رات تھی کرب، غصہ، جھنجھلاہٹ، مایوسی و بے بسی کی اس ملی جلی کیفیت میں وہ اپنے باطن کے ہیجان کو اس طرح بیان کرتی ہے:

> ''یہی قانون تھا۔ یہی انصاف تھا۔ راحت ماں کی نہیں باپ کی امانت ہے بلکہ باپ کی جائیداد ہے۔ اس باپ کی جس کو راحت نے ہوش سنبھالنے پر دیکھا بھی نہیں تھا۔ جس کو اس نے سوتے سوتے کبھی نہیں پکارا۔ جس کی بھوک میں نے اپنے خون سے مٹائی تھی۔ جس کے رونے کی آواز سے شوکت کی نیند خراب ہوتی تھی اور مجھے دوسرے کمرے میں لے جانا پڑتا۔ اور۔ آج انصاف ہو گیا۔ شوکت.....! تم کو انصاف مل گیا ہے۔ مجھے تم سے کچھ نہیں کہنا۔ سوائے اس کے کہ درد کے جس طوفان سے گزر کر میں نے راحت کو پایا تھا اس کی صرف ایک لہر۔ ایک بار بھی۔ اگر تمہارے قریب سے گزر جائے۔ تو۔ ایک کیا۔ تم کئی راحت سمندر میں پھینک دو گے شوکت۔ ! میں جانتی ہوں۔ بلکہ ہر ماں جانتی ہے بس مجھے کچھ نہیں کہنا''۔72

شمیم نکہت نے واحد غائب کی تکنیک میں افسانہ کو دائرہ نما بنا کر اسی نقطۂ آغاز پر اختتام کیا ہے جہاں وہ عورت اپنے بچے سے جدا ہونے کے تصور میں بیقرار ہو رہی ہے اس درمیان وہ ماضی سے متعلق سوچوں میں گم ہے۔ کالج میں اس کی شوکت سے ملاقات، محبت، ازدواجی زندگی کی تلخیاں، بحث و مباحثے، راحت کی آمد کا خوبصورت دور اور تلخیوں میں اضافے کے بعد ان کی علیحدگی۔ مصنفہ نے افسانے میں اس امر کی وضاحت کی ہے کہ اگر عورت تعلیم سے بہرور ہو اور صحیح و غلط کی تفریق کو ان قدیم فلسفوں اور مذاہب کے بجائے جن میں اسے کمتر اور ہر برائی کی جڑ قرار دیا گیا ہے اپنے ذہن و فکر کو اپنا مصدر بنائے تو یہ مرد اور معاشرہ آج بھی ایسی عورت کو قبول کرنے کا اہل نہیں ہوتا۔ ایسی عورت جو مدعا پیش کر سکے، اپنا اختلاف درج کر سکے اور اپنے حقوق کے متعلق سوال کر سکے وہ اس مرد اساس معاشرے کو قبول نہیں ہے اور وہ اسے عبرت کا نشان بنا کر آئندہ اپنے حقوق کا مطالبہ کرنے والی ان تمام آوازوں کو مٹا دینا چاہتا ہے۔ اسے ایسی ہی عورت پسند ہے جسے وہ بآسانی زیر کر لے۔

افسانہ ممتا کا کرب بھی اسی قسم کا افسانہ ہے جس کی مرکزی کردار 'منجیت کور' ہے افسانہ منجیت کور کی ہمسائی کی زبانی بیان ہوا ہے جس کی بنا پر افسانہ تعصب و جذباتیت اور جانب داری کے تمام ممکنہ امور سے پاک ہو کر متوازن صورتِ حال کا عکاس بنا ہے۔ اگر افسانہ منجیت کور کی زبانی بیان ہوتا تو وہ جذباتیت کا شکار ہو سکتا تھا اور اگر گھر کے دیگر افراد میں سے کوئی راوی ہوتا تو اس ماں کے درد کو مصلحت کے لبادہ میں ڈھانک دینے کا امکان موجود رہتا۔ قصے کا پس منظر اس طرح ہے کہ منجیت کور کی ماں مسز گردیال راوی کے نئے ہمسائے ہیں۔ تجارت پیشہ یہ خاندان صرف سردیاں گزارنے اپنی کوٹھی میں آتے ہیں افرادِ خانہ میں والدین اور منجیت کور کے علاوہ ایک بڑا بھائی بھی ہے۔ منجیت کور کی شادی کے بعد اس کے والدین ایک ایکسڈنٹ کا شکار ہو کر اس دنیا سے رخصت ہو گئے ہیں اور اب بھائی کے اصرار پر منجیت کور اپنے شوہر اور دو بیٹیوں کے ساتھ اس کوٹھی میں منتقل ہو گئی ہے۔ اس لیے اب وہ بھی راوی کے رابطے میں ہے۔ قصہ میں پیچیدگی اس وقت آتی ہے جب اچانک اس کا شوہر ایک ایکسیڈنٹ کا شکار ہو کر اسے تنہا چھوڑ جاتا ہے اور وہ حواس باختہ اپنے غموں پر ماتم کناں بھی نہ ہو پاتی تھی کہ اس کی معصوم بچیوں کے مقدر کے فیصلے بھی ہو جاتے ہیں اس صورت حال میں منجیت کور کی جان کنی کی سی کیفیت کا بیان راوی کی زبانی ملاحظہ ہو:

> ''اس نے کاغذ کے دو ٹکڑوں پر دستخط کر دیئے تھے ایک کاغذ اس کے جیٹھ نے لے لیا۔ دوسرا اس کے بھیا نے۔ اس کے کلیجے کے دو ٹکڑے ہو گئے تھے اسکے اندر سے کچھ اچک کر اس کے حلق میں اٹک گیا تھا۔ اس کی آنکھیں باہر کو آنے لگیں

تھیں۔اس کے کانوں میں طوفان ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔اور اس کے دونوں ہاتھ خالی تھے اس کے بھیا نے اس کے دونوں ہاتھ خالی کر دیئے تھے تا کہ ہتھیلیوں پر مہندی رکھنے میں آسانی ہو جائے لیکن اس کی ہتھیلیوں پر انگارے سلگ رہے تھے۔لوگوں نے اس کے بھلے کے لیے اس کی ممتا کا گلا گھونٹ دیا تھا۔

وہ اب رنجنا اور بیتا کی ماں نہیں آنٹی تھی اور اسے روز اس کرب سے گزرنا تھا۔اس کی بچیوں کو اس سے دور رکھنے کی کوششیں کی جانے لگیں کہ کہیں ممتا کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر انھیں پھر سے خود میں نہ سمالے۔ایک ماں اپنی ممتا دان کر کے کتنی مجبور و تہی دست ہو جاتی ہوگی اس کا اندازہ صرف وہی لگا سکتا ہے جس نے خود یہ آگ کا دریا پار کیا ہو۔مصنفہ نے افسانے کے بین السطور میں معاشرے کے اس اجتماعی شعور پر بھی طنز کیا ہے جہاں کنواری لڑکیوں کو بآسانی دوسرے بچوں کی ماں بنا کر پیش کر دیا جاتا ہے مگر ایک مرد غیر بچوں کو اپنانے پر کبھی رضامند نہیں ہوتا کیونکہ وہ مختار ہے اور عورت مجبور، مگر وہ اس ممتا کا کیا کرے جو نہ مجبور ہے اور نہ مصلحت آشنا ہے۔

افسانہ 'بھاگیہ' میں مصنفہ نے بال وواہ کو موضوع بنایا ہے۔حکومت نے اس سنگین مسئلہ پر قانون نافذ کر کے اسے ناجائز تو قرار دے دیا ہے مگر عملی سطح پر اب بھی اس رسم قبیح کی پیروی جاری ہے۔افسانے کی شاہ کردار 'مہوا' ہے جس کی اتنی کم عمر میں شادی کر دی گئی کہ جب وہ بیوہ ہوئی تو اس کی عمر فقط دس سال کی تھی۔گھر والوں نے جب اس کی چوڑیاں توڑتے ہوئے اسے بتایا کہ 'تو ودھوا ہو گئی ہے' تو وہ اس کا مفہوم بھی نہ سمجھ سکی اور جب اس کی معصوم سہیلیاں بھی اس مشکل لفظ کا مطلب سمجھانے میں ناکام رہیں تو اس نے اپنی بھابھی سے پوچھا:

''مجھ میں کیا ہو گیا ہے۔سب گاؤں کے دیکھ کر ہائے ہائے کر رہے تھے۔اور اس کی بھابھی نے بتایا تھا۔تیرا دولہا مر گیا ہے۔وہ چپ تو ہو گی۔پر پھر بھی سمجھ نہ سکی کہ جب مرا دولہا ہے۔تو۔ودھوا وہ کیسے ہو گی''۔74

اور اس کے بعد لوگوں کے بدلے ہوئے رویے اور شادی بیاہ کی رسوم سے اسے الگ تھلگ رکھنے نے اتنا تو سمجھا دیا کہ اس میں واقعی کوئی عیب ہو گیا ہے۔وقت اپنی رفتار سے گزرتا رہا حتیٰ کہ وہ خود ہی اس مشکل لفظ کے مفہوم سے آشنا ہو گئی اور اپنی سہیلیوں کی خوشحالی زندگی دیکھ اسے اپنی محرومیوں کا احساس شدت سے ہونے لگا مگر اس مشترکہ خاندان میں کسی کو بھی نہ اس کے جذبات و احساسات کی پرواہ ہے اور نہ ہی اس کے مستقبل کی فکر کیونکہ اس کے بھاگیہ کی سیاہی ان کے گھروں کو چمکانے کے کام آ رہی تھی۔صرف ایک 'رگھو' کو اس سے ہمدردی تھی جو اس کے چچا کا بیٹا ہے اور یہ ہمدردی کب ایک دوسرے جذبے کو بیدار کر دیتی ہے اس کا علم اسے بھی نہ ہو سکا۔نہایت تگ و دو کے بعد رگھو مہوا کے دل سے گھر، سماج اور مذہب کا خوف نکال کر اپنی محبت کا دیا روشن کر کے اسے شہر لے آتا ہے جہاں وہ دونوں ایک نئی زندگی کی شروعات کرتے ہیں۔مگر فرسودہ رسم و رواج اور دھرم و شاستر کے رکھوالے مذہب پر کس طرح آنچ آنے دے سکتے تھے وہ ان کے قدموں کے نشان ڈھونڈتے ہوئے وہاں تک پہنچ گئے اور دو محبت بھرے دلوں کو ہمیشہ کے لیے جدا کر دیا۔مصنفہ نے اس دل دوز افسانے میں اس فرسودہ رسم و رواج سے آلودہ معاشرے اور ان کے مذہبی عقائد کو طنز کا نشانہ بنایا جہاں انسان اپنی مرضی کی زندگی گزارنے اور بنیادی خوشیوں کے حصول کا بھی حق دار نہیں ہے۔

شمیم نکہت نے جدید ہندوستانی عورت کے متفرق مسائل اور نفسیاتی پہلوؤں کو اپنے افسانوی ادب میں بطور خاص جگہ دی ہے۔جو الگ الگ سطحوں پر عورتوں کے استحصال کی داستان بیان کرتے ہیں، 'ثروت آپا' کے عنوان سے پیش کیا گیا افسانہ ایک ایسی عورت کا کردار ہے جس نے اپنے شوہر اور اس کے گھر والوں کی خدمت کے لیے اپنی زندگی وقف کر دی اس آس پر کہ شاید زندگی میں بہار آ جائے مگر خزاں ہی ان کا مقدر بنی۔نچلے متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والی ثروت آپا والدہ کے انتقال کے بعد خالہ کے گھر منتقل ہو گئیں۔ان کی معمولی شکل و صورت ان کی نسبت طے کرنے میں دشواریوں کا سبب بنتی ہے بڑی مشکلوں کے بعد جب ان کی شادی ہوئی تو مزید جہیز کے لالچ میں پھر گھر بھیج دی گئیں۔دوبارہ ساز و سامان اور مزید جاں فشانی کے جذبے سے سرشار ہو کر جب سسرال آئیں تو وہ خدمات انجام دیں جو چار خادموں سے مل کر بھی نہ ہوتی اور اپنی اس جانفشانی و عرق ریزی کے صلے میں ملی ہوئی معمولی توجہ کو اپنی متاع کل تصور کرتی ہیں اور ان تمام خدمتوں کے عوض شوہر نامدار کے پُر فریب محبت بھرے دو بول ان کے کھوکھلے ہوتے جسم میں نئی رمق پیدا کر دیتے مگر جب ان خدمتوں کا بوجھ ڈھوتے ڈھوتے وہ خود بیمار ہوئیں تو پھر گھر بھیج دی گئیں اور یہ سلسلہ چلتا ہی رہا۔افسانے کی راوی یعنی ثرات آپا کی خالہ زاد بہن اس سلسلے میں ان سے مختلف خیالات کی حامل ہے شمیم نکہت نے ثروت آپا کے برعکس نظریے کی حامل رفو کا کردار پیش کر کے ان کے کردار کو مزید ابھار کر قابل ہمدردی بنا دیا ہے ان کی تمام خدمات و قربانیوں کے بعد بھی ان کا مجازی خدا ان سے کبھی راضی نہیں ہوتا بلکہ دوسری شادی کر کے اپنے حاکم مطلق ہونے کا ثبوت پیش کرتا ہے۔ثبوت پیش کرتا ہے۔

افسانہ 'زندگی کا رخ' بھی اس قسم کی کہانی ہے جس کا مرکزی کردار 'ریکھا' ہے ثروت آپا اور رکھا کی حیثیتوں میں زیادہ فرق نہیں ہے دونوں اپنے سسرال والوں کی خدمت کے لیے وقف ہیں لیکن 'ثروت آپا' اپنے وجود کی نفی کرنے پر بھی راضی تھیں اور 'ریکھا' میں اپنے وجود کی اہمیت کا احساس باقی ہے۔ 'رشتے اور فاصلے' میں ایک عورت کے داخلی کوائف اور اس کی محرومی کو موضوع بنایا گیا ہے۔ افسانہ 'گھروندے' طبقۂ ادنیٰ سے تعلق رکھنے والی زینب جیسی ہزاروں لڑکیوں کی داستان بیان کرتا ہے۔ زینب جس نے چھپر اور ٹاٹ کے تنگ و تاریک جھونپڑے میں اپنا بچپن گزارا ہے اس نے ہمیشہ ایک محفوظ و مامون اور کشادہ گھر کا خواب دیکھا مگر اس کی سماجی حیثیت اس کے خواب کی تکمیل میں مانع رہی۔

افسانہ 'وہ' بھی پسماندہ طبقے سے تعلق رکھنے والی لڑکی 'دھرمتی' کی کہانی ہے اس افسانے میں مصنفہ نے اس بوسیدہ معاشرے اور سماجی نظام پر گہرا طنز کیا ہے جہاں عورت بدنامی کے خوف سے اپنی آرزوؤں کا گلا گھوٹنے پر مجبور ہے ان افسانوں یعنی 'رشتے اور فاصلے'، 'گھروندے' اور 'وہ' میں حالات اور غربت نتیجہ قرار پاتے ہیں عورت کی مجبوری و محرومی کے اور بعض افسانے ایسے ہیں جن میں ان وجوہات کے بجائے خود غرض اور چالاک مرد عورت کی اس ناگفتہ بہ حالت کی وجہ قرار پاتا ہے۔

عورتوں کے مسائل و حقوق کے متعلق لکھتے ہوئے ان کی بعض کہانیوں میں مرد کا سفاک اور بے رحم چہرہ پیش ہوا ہے جس نے عورت کو ایک ذی روح کے بجائے ہمیشہ اپنے فائدے کی چیز سمجھ کر اس کا استعمال کیا اسے مساوی حقوق دینا تو درکنار انسان ہونے کا حق بھی نہیں دیا۔ 'سودا'، 'بیمہ' اور 'سائے' اسی قسم کے افسانے ہیں۔ افسانہ 'سودا' معصوم اور بھولی بھالی لڑکیوں کو فریب دے کر انھیں بالا خانوں پر فروخت کر دینے کی دل سوز داستان ہے افسانہ 'بیمہ' بھی کم و بیش اسی طرح کی کہانی ہے۔ افسانے کی مس شاردہ پارو کے برعکس ایک برسر روزگار خاتون ہیں اپنی سنجیدگی و سادگی سے ان کی شخصیت بارعب بھی ہے۔ ڈرامائی انداز کے اس افسانے کی بنت مصنفہ نے اس کامیابی سے برتی ہے کہ تمام افسانے میں کہیں بھی قاری اس انجام کی بھنک بھی نہیں پاتا اور پوسٹ مارٹم کی رپورٹ لیے انسپکٹر کے جملے ''شاردا کو گلا گھوٹ کر مارا گیا ہے بعد میں اس کی لاش نیچے گرائی گئی ہے''۔ قتل کا اشارہ اس کے شوہر کی جانب کرتے ہیں تو اس سے پہلے کے تمام دھندلے نقوش واضح ہو جاتے ہیں کہ دولت کے لالچ میں ایک شوہر نے سنگدلی سے اپنی بیوی کا قتل کر دیا۔ افسانہ 'سائے' بھی ایک ایسے مرد کو پیش کرتا ہے جس نے دولت اور عہدے کے لالچ میں اپنی محبت کو فریب دے دیا۔

ان تمام افسانوں کی خواتین کردار میں ایک قابل غور بات یہ ہے کہ یہ مختلف سماجی حیثیتوں سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان کے تعلیمی اور فکری زاویے بھی مختلف ہیں۔ ثروت آپا تعلیم سے بے بہرہ اور اپنی قسمت پر مکتفی ہیں 'سودا' کی پارو بھی تعلیم سے ناخواندہ ہے مگر اپنے بہتر مستقبل کی فکر میں کوشاں ہے 'سائے' کی شاردا تعلیم یافتہ اور برسر روزگار ہے اور گھر والوں کی ذمہ داریوں کا اس پر بار ہے اور 'بیمہ' کی مس شاردہ سرکاری دفتر میں آفیسر ہے معاشی طور پر مستحکم خود کفیل و خود مختار ہے۔ مگر پھر بھی یہ تمام عورتیں اپنی معصوم فطرت کے سبب اس پر فریب دینا کے مکر کا شکار ہو جاتیں ہیں اور شکست خوردہ زندگی ہی ان کا مقدر بنتی ہے کیا یہ محرومی اس کا ازلی مقدر ہے یا پھر چالاک اور خود غرض معاشرے نے اس مقدر کو اس کے لیے ملزوم کر دیا ہے۔ ان تمام افسانوں کی زیریں سطح سے یہی سوال ابھر کر سامنے آتا ہے جو اپنے قارئین کو غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔ یہ افسانے محض کسی روایت کی پاسداری میں نہیں لکھے گئے بلکہ ہمدردی و محبت کے اس جزبے سے مملو ہو کر خلق کیے گئے ہیں اور ان تمام افسانوں میں ایک درد مشترک موجود ہے جو ان کو آپس میں جوڑے رکھتا ہے۔

فنی لحاظ سے اگر جائزہ لیا جائے تو شمیم نکہت اپنے افسانوں کا مواد اردگرد کی دنیا سے اخذ کرتیں ہیں۔ ان کے افسانوں کے پس منظر میں شہری قصباتی و دیہی زندگی اپنے تمام مثبت و منفی پہلوؤں کے ساتھ اجاگر ہوتی ہے۔ پلاٹ کی ترتیب و تنظیم پر وہ بطور خاص توجہ دیتی ہیں۔ ان کے اکثر افسانے دائرہ نما ہوتے ہیں یعنی کسی ایک نکتے سے شروع ہو کر دائرہ نما گھومتے ہوئے پھر اسی نکتے پر آ کر ختم ہو جاتے ہیں شمیم نکہت کے افسانے ان سنگین المیوں کا بھی احاطہ کرتے ہیں جو تمام انسانیت کا دل دہلا دیں اور ان بے ضرر قسم کے لوگوں کا بھی درد بیان کرتے ہیں جن کی موت سے کسی کو بھی افسوس نہیں ہوتا۔ وہ انسانیت اور رواداری کے فقدان پر بیقرار ہو اٹھتی ہیں مگر انھیں امید ہے کہ مستقبل ضرور بہتر ہوگا۔

□□□

Shaista Alam
Research Scholar
Department of Urdu
Aligarh Muslim University
Aligarh-202001 (U.P)
Email- shubhikhan8@gmail.com

شاعرات کے منتخب اشعار

یاد میراث ہے یادیں ہی امانت ہیں مری
وہ تو محفوظ ہیں اب ان کی عنایت بھی نہیں

تلخ یادوں کا دفینہ ہے یہ معصوم سا دل
تلخ یادوں سے ہمیں کوئی شکایت بھی نہیں

آصفہ زمانی

کیا بتاؤں کہ کس گمان میں ہوں
مستقل ایک امتحان میں ہوں

آبلہ پا ہوں اور سفر میں ہوں
پر بریدہ ہوں اور اڑان میں ہوں

آصفہ نشاط

تیرے پہلو میں جی رہی تھی کبھی
زندگی میری زندگی تھی کبھی

مجھ کو قائل نہ کر دلیلوں سے
میں بھی تقدیر سے لڑی تھی کبھی

الماس شبی

بلا سے کتنے ہی طوفاں اٹھے بحر محبت میں
ہر اک دھڑکن یہ کہتی ہے مرا ساحل ہے تو ہی تو

ترے بخشے ہوئے رنگوں سے ہے پر نور ہر منظر
یقیناً بحر و بر کی روح میں شامل ہے تو ہی تو

امیتا پرسورام میتا

کون اس دور میں ہوتا ہے کسی کا ساتھی
زندگی تجھ کو نبھانے کے لیے زندہ ہوں

جو ترے پیار کا صدیوں سے ہے واجب مجھ پر
ہاں وہی قرض چکانے کے لیے زندہ ہوں

اناد ہلوی

جن کے آنگن میں امیری کا شجر لگتا ہے
ان کا ہر عیب زمانے کو ہنر لگتا ہے

چاند تارے مرے قدموں میں بچھے جاتے ہیں
یہ بزرگوں کی دعاؤں کا اثر لگتا ہے

انجم رہبر

گہرے پانی میں ذرا آؤ اتر کر دیکھیں
ہم کو دریا کے کنارے نہیں اچھے لگتے

میری تنہائی سے کہہ دو کہ سہارا چھوڑے
زندگی بھر یہ سہارے نہیں اچھے لگتے

اندرا ورما

ہجر تقدیر نہیں وصل کا وعدہ بھی نہیں
ہم نے کھویا بھی نہیں آپ کو پایا بھی نہیں

اب وہ ویرانی وہ تنہائی وہ گمنامی ہے
اب کوئی مجھ سے وابستہ تماشا بھی نہیں

اننیا رائے پراشر

(بحوالہ ریختہ ویب سائٹ)

ڈاکٹر شبنم رضوی

'کسی دن' کا ایک یادگار کردار

اقبال مجید کا ناول ''کسی دن'' ضخامت کے لحاظ سے بہت مختصر ہے مگر مصنف نے اس ناول میں گاگر میں ساگر بھرنے کا کام انجام دیا ہے۔ 1998 میں شائع ہوا یہ ناول سیاسی اور سماجی ناولوں کے دائرے میں شمار ہوتا ہے۔ اس ناول میں ناول نگار نے چند ایسے کردار تخلیق کر دیے ہیں جو ان کے ناول کو یادگار بنا دیں گے۔ انھیں کرداروں میں ایک کردار مموخاں کا ہے۔ جب جب اردو ادب میں یادگار کرداروں کا ذکر کیا جائے گا تب تب نذیر احمد اکبری، اصغری، ابن الوقت، سرشار کا خوجی، آزاد اور حسین آرا، رسوا کا امراؤ جان ادا، عصمت کا ثمّن میں (میرا میر چندانی، چاندنی بیگم) جیسے چند ایسے

کرداروں کے ساتھ موخان کا ذکر بھی ہوگا اور آنے والا وقت یاد کرے گا۔

''کسی دن'' کی کہانی الجھی ہوئی اور پلاٹ بے ربط ہے۔ کہانی پلاٹ کے جال میں پھیل کر گمراہ نظر آتی ہے۔ پڑھیے تو بھی الجھی سی لگے گی مگر جہاں تک کردار نگاری کا تعلق ہے یہی کردار اس کی جان ہے اور ناول ختم ہونے کے بعد بھی قاری ان کرداروں کو بھول نہیں پاتا۔ ویسے تو اہم کرداروں میں پرتاپ شکلا، شہباز، عبدل قصاب، شوکت جہاں اس کی سوتیلی ماں اکبری بیگم اور قدرت اللہ کی بیٹی بٹو وغیرہ ہیں۔ ان سب میں سب سے زیادہ انسانیت کے قریب اگر کوئی کردار ہے تو وہ ہے موخان۔ قاری سے موخان کی پہلی ملاقات اس وقت ہوتی ہے جب ناول کی ہیروئن اپنے بھائی کی بے عزتی کا بدلا لینے کے لیے سیاسی لیڈر شہباز خان کے پاس جاتی ہے۔ شہباز خان تو اس کو صرف دلاسا دے کر ٹال دیتا ہے مگر وہیں موجود موخان، شوکت جہاں کی مدد کرنے کا عزم کر لیتا ہے اور قدرت اللہ کی بے عزتی کا بدلا کچھ اس انداز سے لیتا ہے کہ دل دہل اٹھتا ہے۔ مصنف عبدل قصاب اور اس کے دو بھتیجے کے ساتھ جو ظالمانہ سلوک کرتا ہے وہ قابل ذکر بھی ہے اور قابل سبق بھی۔

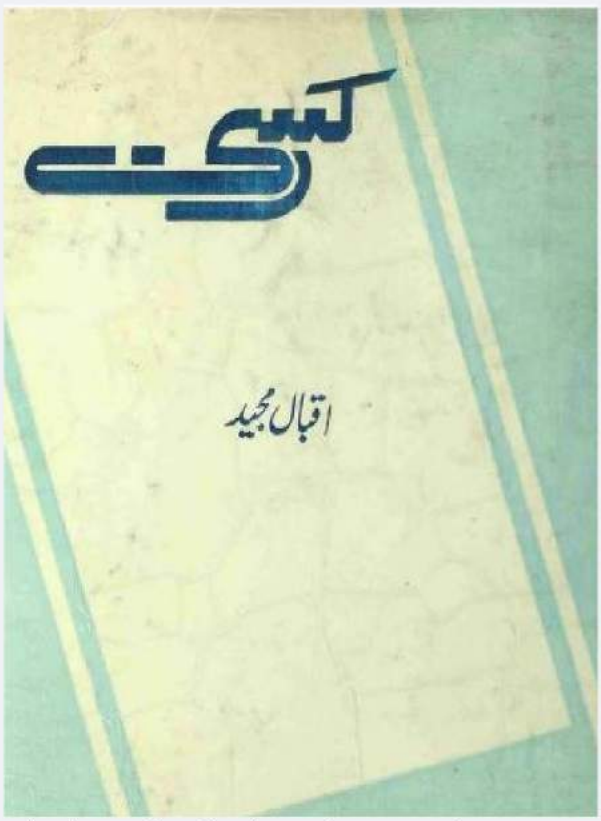

موخان کے کارندے عبدل قصاب کو لے کر آم کی دعوت کے لیے اس کے باغ میں لے جاتے ہیں جہاں یہ تختی لٹکی تھی جس پر صاف صاف لکھا تھا۔

''..... یہ باغ موخاں صاحب کی ذاتی ملکیت ہے اس میں مالک کی اجازت کے بغیر داخل ہونا اور ملکیت کو کسی طرح کا نقصان پہنچانا غیر قانونی ہوگا۔'(133)

اس باغ میں لے جایا گیا اور زبردستی اس کو آم کھلایا گیا۔ مصنف کا بیان غضب کا ہے۔

''عبدل کا ہاتھ بڑھ گیا۔ آم لے کر اس نے زہر مار کیا اور ہاتھ جوڑ کر بولا'' مجھے جانے دو میں معافی مانگتا ہوں''

''بغیر چھلکوں کا آم ہم آدمیوں کو کھلاتے ہیں۔ تو چھلکوں کے ساتھ کھا.....''

پھر عبدل کو چھلکے دار آم کھلائے گئے۔ جب پانچواں آم کھا رہا تھا تو اس کا پیٹ پھول چکا تھا اور سانسیں تیز تیز چل رہی تھیں۔ پھر چھاتی پر سوار ہو کر چار آم اور کھلائے گئے۔ جب اس کی ناک اور منہ سے جھاگ چھوٹنے لگا تو لمبے قدموں والے نے اس کی چھاتی پر سوار مستنڈے لٹھیت کو جو کپڑے سے منہ چھپائے تھا حکم دیا کہ ابھی تین آم کھانے کی جگہ اور باقی ہے۔ عبدل نے اپنے سینے پر قے کر دی۔ اس کی آنکھوں کے سفید سفید گولے بار بار پھٹے پڑ رہے تھے۔ پسینے سے اس کا آدھا بدن چپچپا رہا تھا.....''(53)

اس پر بھی لوگوں کا جی نہیں بھرا تو حلق میں اپنی بیچ والی انگلی خوب اندر تک ڈلوا کر قے کرائی گئی اور قے ہو جانے پر پھر اسے دو آم اور کھلائے گا اور جب اس کی آنکھیں باہر کو نکلنے لگیں اور نبض دھیمی ہو گئی تو اسے اوندھا کر دونوں پیر تین فٹ اوپر اٹھا کر قے کرائے گا اور جب اس کی نقاحت سے گردن تک ٹھہر نہ سکتی تھی اور بار بار غشی کا دور پڑ رہا تھا تب اس کے کان میں آواز گئی کہ یہ پانچ آم ہوش میں آنے پر کھلا دینا۔ یہ انتقام ایسا تھا کہ جب موخان حلف اٹھا کر کہہ سکتا ہے کہ اس نے تو عبدل قصاب کو کبھی آم کھلایا ہی نہیں۔

موخان انتقام لینے میں بڑے صبر و تحمل سے کام لیتا تھا۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے ان آموں سے ہی دنیاداری سیکھی ہے اور انتقام لینا بھی۔ جب موخاں نے آموں کا نیا باغ لگوایا تو باغبان راحت میاں نے ان کے اس باغ کا پانی کئی بار چوری سے کاٹ کر اپنے نئے باغ میں لگوا لیا۔ جب یہ خبر موخاں کو ملتی ہے تو وہ اس دن راحت خاں کے یہاں سفید شیروانی اور چاندی کی چھڑی لے کر ان کے گھر ملنے گئے۔ گٹھیا کی پرانی مریض ان کی

بیوی کے لیے اپنے خاندانی تیر بہ ہدف نسخہ بھی بنوا کر لے گئے اور جتنی دیر وہاں رہے وہ اپنے ہاتھوں کے پوروں پر گنتے رہے کہ میں یاد رکھوں گا کہ تو نے میرے باغ کا پانی کاٹا تھا اور یہ جملے موخاں نے کئی برس دہرائے مگر دوستی کم نہ کی۔ دوسرے سال راحت میاں کے نواسے کے عقیقے میں جوڑا اور مٹھائی وغیرہ لے کر پہنچے مگر اس وقت بھی موخاں دل میں یہی دہرا رہے تھے۔ میں یاد رکھوں گا کہ تو نے.....'' ایکا دسال اور گزر گیا اور دھیرے دھیرے آٹھ برس گزر گئے اور جب آٹھویں برس پہلی فصل سامنے آئی تو مو خاں نے اپنے دل کی چوٹ کو پھر باہر نکالا وہ اکدم تازی تازی تھی۔ موخان اکثر کہتے تھے کہ

''.....صبر اور انتظار کے معاملہ میں حضرت ایوب کی قسم آم کے باغبان کا کوئی مقابلہ نہیں کرسکتا.....''

راحت میاں اپنی پہلی فصل کا آم ٹرک میں بھر کر منڈی پہنچے تو موخان ساری منڈی کو منھ مانگے داموں خرید چکے تھے۔ کسی نے اس آم کی قیمت ہی نہ لگائی۔ دوسرے دن اور پھر تیسرے روز بھی آم منڈی پہنچا۔ اب آم میں داغ لگ گیا تھا اور پلاننگ کے مطابق کوڑی کے دام بھی کوئی لینے کو تیار نہیں تھا۔ اپنے آم کی یہ توہین اور اپنی محنت کی یہ ہتک دیکھ کر راحت خان پاگل ہوگئے اور مارے غصہ میں سارا آم سڑکوں پر لٹا دیا۔ لوگوں نے سنا اور دیکھا۔

''.....تھوڑی دیر بعد منڈی کی بھیڑ نے دیکھا ایک ٹرک سے آم لٹائے جارہے ہیں اور سڑک پر گھومتی پھرتی آوارہ گائیں ان پر جھکے ہوئے ہیں.....''(52)

راج کپور کی ایک فلم آئی تھی ''تیسری قسم'' یہاں بھی جب موخان، شوکت جہاں کے قتل پر پرتاپ شکلا کو مارنے کی قسم کھاتا ہے کہ ''.....قسم قرآن کی پرتاپ تجھے ڈیڑھ سال کے اندر اس دنیا سے اٹھ جانا ہے.....'' اور اس پرتاپ شکلا سے موت کا بدلا لینے کی جو پلاننگ موخاں نے کی تھی۔ ایک روز جب موخان نے اس کا حساب لگایا تو احساس ہوا کہ دشمنی کا سودا تو بڑا مہنگا ہے۔ مگر خیر

''.....موخان نے حساب لگایا۔ لگ بھگ بائیس ہزار روپے گیارہ مہینے اور انیس دن میں پرتاپ شکلا کو صرف دوست بنانے کے پروجیکٹ پر خرچ کئے جا چکے تھے اور اس عرصہ میں وہ کم سے کم پچاس ساٹھ بار پرتاپ سے ہاتھ ملانے کے بعد اپنے دل میں دہرا چکا تھا: قسم قرآن کی.....''(90)

پرتاپ شکلا کو رات گزارنے کے لیے ریسٹ ہاؤس میں بلایا گیا۔ پلاننگ کے مطابق انھیں عمدہ شراب کے ساتھ ایک دہقانی عورت بھی پیش کی گئی جس نے پلاننگ کے مطابق خوب دنگا فساد مچایا اور آخر جب پرتاپ شکلا برہنہ ہو چکا اس نے شور مچانا شروع کیا۔ تمام نوکر چاکر جمع ہوگئے اور آخر کار دہقان عورت نے سبھی کے سامنے اس کے گلے میں اتنے زور کا دانت کاٹا کہ پرتاپ شکلا اس دنیا سے واقعی چل بسے۔ اور موخان اپنی قسم پوری کرنے کے بعد اطمینان سے سوئے۔

موخان کا دشمنوں کے لیے جابرانہ رویہ ہمیں چونکا تا ضرور ہے مگر موخان کی پلاننگ صبر و تحمل کے ہم قائل بھی ہوجاتے ہیں۔ ان کے انتقام پر قاری کو موخان سے نفرت نہیں ہوتی بلکہ ایک سچے اور کھرے انسان کے طور پر وہ آخر تک یاد رہتی ہے۔ دراصل اس کی وجہ یہ ہے کہ ناول نگار مو خان کے کردار میں جہاں ظالمانہ فطرت کو نمایاں کیا ہے وہیں وہ ایک رحم دل اور ہمدرد انسان کے روپ میں بھی نظر آتے ہیں۔ اپنے کارندوں کی مدد کرتے ہیں ان کی بیٹیوں کی شادی کرواتے اور دوستی نبھاتے نظر آتے ہیں۔ جب وہ شوکت جہاں اور قدرت اللہ کی بے عزتی کا بدلا پرتاپ شکلا سے لیتا ہے تب اس کے پیچھے شوکت جہاں کے والد سے پرانی دوستی نبھاتا نظر آتا ہے۔ جب وہ راحت خان کے ساتھ بدلا لیتا ہے تب بھی وہ سچائی اور بے ایمانی میں سچائی کا ساتھ دیتا نظر آتا ہے۔ اسی طرح جب شوکت کا خون پرتاپ کر دیتا ہے تو ایسے ظالم انسان کو مارنے کا کام بھی بڑے صبر کے ساتھ انجام دیتا ہے۔

اور اسی وجہ سے کیونکہ مصنف نے اس شخص میں جہاں برائی دکھائی ہے ظالمانہ اور جابرانہ رویہ دکھایا ہے وہیں اس کا صبر، سوجھ بوجھ اور دور اندیشی کو بھی بخوبی پیش کیا ہے۔ اقبال مجید کا یہ کمال ہی کہا جائے گا کہ ناول ختم کرنے پر جو ناول کا تاثر باقی ہے اس میں موخاں سب سے زیادہ ہے۔ ہمیں کہانی یاد نہیں رہتی مگر موخاں کا کردار ذہن پر چھایا رہتا ہے۔ یہ اتنا دمدار، جاندار اور پرکشش کردار ہے کہ اس کو ماننے کے بعد ناول پڑھنے کو جی چاہنے لگے گا۔ یہی اس کردار کی سب سے بڑی خوبی ہے۔

□□□

Dr. Shabnam Rizvi
Head Dept. of Urdu
Karamat Husain Muslim Girls PG College
Nishat Ganj
Lucknow-226001 (U.P)
Mob: 9415547544

ڈاکٹر منصور خوشتر

ڈاکٹر شہناز فاطمی
کی تخلیقات میں احساسات کی تابانی

ڈاکٹر شہناز فاطمی اردو، ہندی اور انگریزی کی معتبر ادیبہ ہیں۔ ان سے میری صرف ایک ملاقات پٹنہ اردو اکیڈمی میں ایک تقریب کے دوران ہوئی تھی۔ بہت ہی خوش اخلاق، شیریں بیان ہیں۔ پہلی ملاقات نے مجھے کافی متاثر کیا۔

ڈاکٹر شہناز فاطمی کے والد محترم سید سلطان احمد (بہزاد فاطمی) ریٹائرسول ملازم تھے۔ بہزاد فاطمی معروف معتبر شاعر جناب شاد عظیم آبادی کے نبیرہ (پوتا) تھے۔ شہناز فاطمی کی پیدائش 5/جنوری 1949 کو عرب منزل،، شیخ پورہ میں ہوئی۔ ان کی ابتدائی تعلیم والد محترم کی نگرانی میں شروع کی۔ بعد میں ایم۔اے اور پی ایچ۔ڈی کی سندیں حاصل کیں۔ تعلیم سے فراغت کے بعد پولیٹیکل سائنس میں پروفیسر ہوئیں۔ ان کی پہلی تخلیق ''ایک اصول ایک فرض'' ہے جو ''صبح نو'' پٹنہ، جولائی 1971 میں شائع ہوئی۔

ڈاکٹر شہناز فاطمی نے ہندی، انگریزی، اردو سے ہندی تراجم، ترتیب کی شکل میں کئی کتابیں لکھیں۔ یہاں ان کی مطبوعہ اردو تصانیف کا ذکر کرنا لازمی سمجھتا ہوں۔

1۔	درکتے رشتے (ناول)	2012
2۔	لپسا (ناول)	2012
3۔	سشما (ناول)	2012
4۔	لمحوں کی کسک (ناول)	2014
5۔	چاند کی سحر (ناول)	2016
6۔	چراغ تہہ وداماں (افسانے)	2016
7۔	بولتی آنکھیں (ناول)	2017
8۔	دن جو پکھیرو ہوتے (ناول)	2018
9۔	کاسے کہوں (ناول)	2020
10۔	ہرسنگار کے سائے (شعری)	2019

مختلف تصانیف اور ادبی کارناموں کی وجہ سے انھیں بہت سے انعامات واعزازات سے نوازا گیا۔ چند اہم انعامات واعزازات مندرجہ ذیل ہیں:

1 ساہتیہ کار رمن ٹرسٹ کے ذریعہ ایوارڈ۔1993

2 پنڈت رام نارائن شاستری اسارک کی طرف سے سوسوتنز وتر پرسکار۔1996

3 اکھل بھارتیہ بھاشا ساہتیہ سمیلن کے ذریعہ۔ وششٹ سمان پتر۔ 1998

4 اکھل بھارتیہ بھاشا ساہتیہ سمیلن کی مرکزی شاخ (بھوپال) کے ذریعہ ساہتیہ شری۔1998

5 بہار اردو اکادمی، پٹنہ بہار کے ذریعہ ''لمحوں کی کسک'' پر۔2016

6 I.C.W.A. کی طرف سے سمان۔1997

7 گلوبل آبزرور ایوارڈ۔2016

8 ساہتیہ سمیلن شتابدی سمان۔2019

9 حکومت بہار 'خدمات برائے ادب' کے لیے

10 اکبر رضا جمشید ایوارڈ (لائف ٹائم)۔2019

ادبی خدمات کے علاوہ دیگر انتظامی میدان میں بھی ڈاکٹر شہزاد فاطمی نے نمایاں خدمات انجام دیں۔ چند اہم خدمات حسب ذیل ہیں:

1 اکٹنگ پرنسپل۔رمیش جھا مہیلا کالج، سہرسہ

2 صدر شعبہ۔شعبۂ سیاسیات، رمیش جھا مہیلا کالج، سہرسہ۔1972-1982 تک

3 اکزامنیشن کنٹرولر، آر۔جے۔ایم کالج سہرسہ

4 بی اے، بی ایس سی اکزام میں کوآرڈینٹر، جے ایم کالج سہرسہ

5 اکزامنیشن کنٹرولر (جے ڈی ویمنس کالج، پٹنہ 1996-1990 تک لگاتار)

6 صدر شعبہ علم سیاسیات، مگدھ یونیورسیٹی، بودھ گیا

7 مگدھ یونورسیٹی سنڈیکیٹ کی ممبر

8 خواتین کی ہندی کاویہ سنگرہ ''آدیا'' سب ایڈیٹر

9 اکھیل بھارتیہ بھاشا ساہتیہ سمیلن (خواتین شاخ) نائب صدر

10 مدیر اعلی، کالج میگزین ''دیپتی'' جے دی ویمنس کالج پٹنہ (دو سال)

ڈاکٹر شہناز فاطمی کی ادبی خدمات پر مشاہیر ادب نے اپنے تاثرات کا اظہار کیا ہے۔ چند اہم مشاہیر ادب کی آراء اس طرح ہیں:

☆ پروفیسر علیم اللہ حالی:

''ڈاکٹر شہناز فاطمی طبعی طور پر تخلیق کار ہیں۔ ان کی نثری تخلیقات میں آج کے تہذیبی زوال کا منظر نامہ بھی ملتا ہے اور اس کے مداوے کے لیے نسخہ کیمیا بھی ہاتھ آتا ہے۔ ایک صالح، پختہ کار، صاحب تجربہ اور انسانیت دوست اہل قلم کی طرح انھوں نے معاشرے کے پیچیدہ مسائل پر اس انداز سے روشنی ڈالی ہے کہ ان سے تہذیبی اقدار کے تحفظ کا ماحول بھی پیدا ہو سکے۔''

☆ ڈاکٹر شارقہ شفتین:

''ڈاکٹر شہناز فاطمی کا نام فکشن نگار کے طور پر اجنبی اور ناشناس نہیں ان کے کئی ناول اور افسانوی مجموعے منظر عام پر آکر داد و تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ بعض ناولوں پر انھیں مختلف اداروں اور تنظیموں کی طرف سے انعامات بھی دیئے گئے ہیں۔ ان کے تمام ناول صالح مقصدیت سے بھرپور ہیں۔''

☆ ڈاکٹر قمر جہاں:

''ڈاکٹر شہناز فاطمی کا تعلق صوبہ بہار کے ایک ایسے علمی و ادبی خانوادے سے ہے جہاں ہر ذرہ مثل آفتاب ہے۔ شاد عظیم آبادی کے پوتا بہزاد فاطمی کی وہ دختر عزیز ہیں۔ جناب رضا نقوی واہی جو اردو کے ممتاز مزاحیہ شاعر گزرے ہیں، ان کی بہو ہونے کا بھی انہیں شرف حاصل ہے، گویا ایک تعلیم یافتہ اور ادب نواز ہی نہیں بلکہ ادب گر خاندان سے وہ قریبی وابستگی رکھتی ہیں۔ موصوفہ کی بڑی بہن امتیاز فاطمی بھی ادبی حلقے سے اپنے فکشن کے لیے اچھی پہچان رکھتی ہیں۔ محترمہ شہناز فاطمی کا تعلق اردو ادب سے براہ راست نہیں ہے۔ وہ پالیٹیکل سائنس کی پروفیسر تھیں اور چند سال قبل اپنے پیشے سے سبکدوش ہوئی ہیں۔ فرصت کے رات دن کا انھوں نے بہت خوبصورت مصرف لیا ہے گذشتہ دنوں میں ان کے کئی ناول اور ایک شعری مجموعہ منظر عام پر آچکا ہے۔''

سب سے پہلے ان کے شعری مجموعہ ''ہر سنگار کے سائے'' کے حوالہ سے اپنی گفتگو کرتا ہوں۔ ان کا یہ شعری مجموعہ ۲۰۱۸ء میں منظر عام پر آیا۔ اس مجموعے میں غزلیں اور نظمیں ہیں۔ ڈاکٹر شہناز فاطمی نے روایت اور کلاسیکیت کے اسیر میں رہنے کی جگہ اپنی ایک الگ اور منفرد راہ اختیار کی ہے۔ ان کی غزلوں میں اظہار کی سادگی، خیالات میں نجابت و شرافت اور لہجے میں سلاست و بے تکلفی جھلکتی ہے۔ یہاں ان کی غزلوں سے چند اشعار پیش کرتا ہوں جن سے ان کے تخلیقی رویے کی سادگی اور بے محابہ پن کا اندازہ ہوتا ہے:

نہ ملے گا مسجدوں میں، نہ ملے گا مندروں میں
جسے ڈھونڈتا ہے اے دل وہ ملے گا تیرے دل میں

☆☆

وہی ڈوب جائیں گے ساحل پہ آکے
جو انسان طوفاں سے ڈرتے رہیں گے

☆☆

آپ نے جرمِ محبت کی سزا تو دے دی
رسمِ الفت کو زمانے سے مٹا بھی دیتے
ارادہ اٹل ہے تو گرداب کیا ہے
سفینے تو موجوں سے لڑتے رہیں گے

☆☆

موجوں کے تھپیڑوں میں یہ زندگی ساری ہے
ہر سانس میری یارب ہر سانس پہ بھاری ہے
سب چھوڑ گئے مجھ کو میں تنہا تڑپتی ہوں
جو چوٹ لگی دل پر وہ چوٹ تو کاری ہے

''میں نہ روٹھوں گی'' کے عنوان سے ڈاکٹر شہناز فاطمی کی ایک نظم ہے۔ یہ نظم معنویت سے پُر ہے۔ اس نظم میں شاعرہ نے لکھا ہے کہ بچپن کے دن روٹھنے منانے کے ہوتے ہیں۔ کچھ زیادہ پانے کی ضد میں انسان روٹھتا ہے اور پھر وہ مان جاتا ہے۔ جب وہ اپنے ماضی پر غور کرتا ہے تو ایسا لگتا ہے کہ اسے نہیں روٹھنا چاہیے۔ اس نظم میں شاعرہ کے خیالات کی ترجمانی دیکھیے:

میں نے دیکھا تھا
اجالے کی کرن کو
اس نے مجھ سے سرگوشی کی تھی
میری دودھیا سفیدی
اپنے اجالے کے لیے لی تھی
پھر میں نے ہی دیکھا تھا
اس کرن کو
اجالا پھیلاتے ہوئے
روشنی لٹاتے ہوئے
تعریفیں پاتے ہوئے
تب میں مچلی تھی، روٹھی تھی
کچھ زیادہ ہی پانے کو

ڈاکٹر شہناز فاطمی کے کئی ناول منظر عام پر آئے۔ انھوں نے کئی ناول تحریر کیے ہیں۔ لیکن ان کا ایک ناول ''بولتی آنکھیں'' میرے مطالعہ میں رہا ہے۔ اس ناول کے علاوہ ان کے کئی ناول منظر عام پر آ کر قارئین پر اپنے خوشگوار اثرات چھوڑ چکے ہیں۔ مثلاً ''چاند کی سحر''، ''لمحوں کی کسک''، ''لپسا''، ''در کتے رشتے''، ''سشما'' وغیرہ ایسے ناول ہیں جو بیک وقت اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں شائع ہو چکے ہیں۔

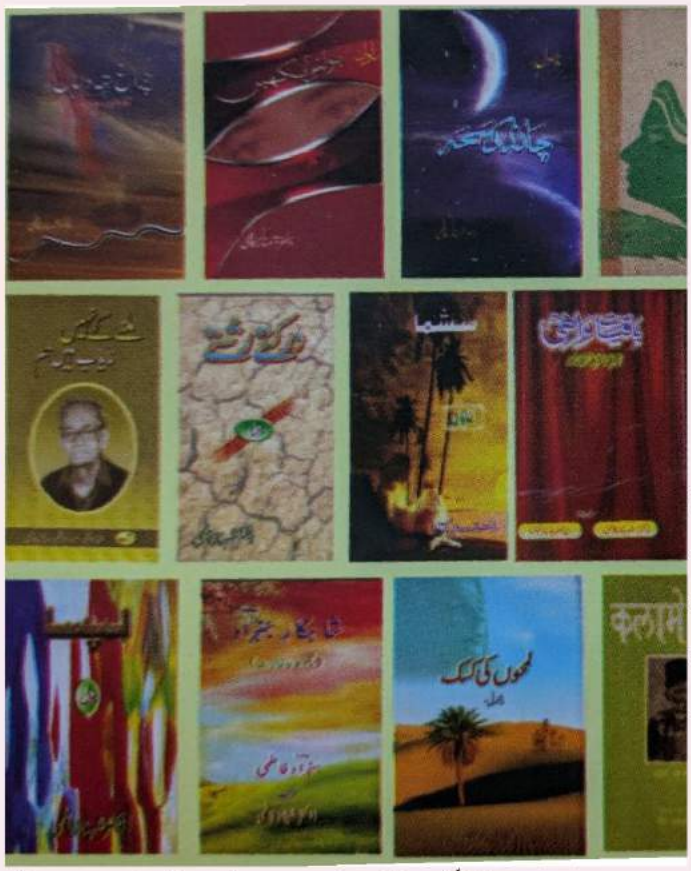

''بولتی آنکھیں'' ایک خوبصورت ناول ہے جس کا عنوان ہی دل میں اتر جانے والا ہے۔ ناول کا موضوع ''بولتی آنکھیں'' کے گرد گھوم رہا ہے۔ اس ناول کا موضوع، کردار، قصہ، پلاٹ، مناظر اور انداز بیان سب کچھ متاثر کرنے والا ہے۔ ناول کا انداز بیان نفسیاتی ہے۔ نیلو اس ناول کا اہم کردار ہے جس کا المیہ ایک بڑے معاشرے کا المیہ بن کر ہمارے سامنے آ گیا ہے جہاں نیلو جیسی سیکڑوں ذہین سلقہ شعار سیرت جدید عورت کی نمائندہ بن کر سوز و ساز، آرزو و جستجو کی بھٹی میں جل رہی ہیں۔

اس طرح ڈاکٹر شہناز فاطمی کے تمام اصناف چاہے وہ شعری ہوں، ناول یا افسانے ہوں، یا تراجم ہوں قارئین کو چونکاتے ہیں اور مطالعہ کی دعوت دیتے ہیں۔

□□□

Mansoor khushter
Darbhanga times
Shaukat Ali House
Purani Munsafi
Darbhanga-846004 (Bihar)
Mob: 9234772764

ڈاکٹر نغمہ نگار

شائستہ بیگم سہروردی کی افسانہ نگاری

اردو میں نسائی افسانوں کی تاریخ کم وبیش سو سال پر محیط ہے۔ مرد قلم کاروں نے عورت کا اپنا پسندیدہ موضوع قرار دیا اور تمام ادیبوں نے عورت کے حوالے سے اپنی تخلیقات میں کچھ نہ کچھ ضرور لکھا ہے گر ان کی تخلیقات کا موضوعاتی اعتبار سے تجزیہ کیا جائے تو نصف سے زیادہ تخلیقات کا محور عورت ہی نظر آئے گی۔ گرچہ ابتدائی دور کے افسانوں اور ناولوں کے موضوعات اصلاحی ہی رہے۔ ان میں عورتوں کی تعلیم وتربیت اور اصلاح کا جذبہ کارفرما نظر آتا ہے۔ جب خواتین قلم کاروں کا ادبی دنیا میں داخلہ ہوا تو انھوں نے بھی اپنی تخلیقات میں نسائی مسائل کو اہمیت دی، انھوں نے عہد حاضر کے سلگتے ہوئے مسائل، زندگی کے نشیب و فراز، خواتین کی ناخواندگی، زندگی کے مختلف شعبوں میں عورتوں کے ساتھ روا سیاسی، سماجی اور جنسی استحصال اور ان کی نفسیات کی پر پیچ تہوں کو بھی کھنگالا ہے۔ اردو افسانے کی دنیا میں خواتین افسانہ نگاروں کی خدمات سے چشم پوشی نہیں کی جاسکتی۔ سرزمین بنگال میں افسانے کی ترویج واشاعت میں مرد قلم کاروں کے ساتھ خواتین بھی سرگرم عمل رہی ہیں۔ انھوں نے عصری تقاضوں کے تحت افسانے لکھے جو ان کی سیاسی اور سماجی بصیرت، ادب سے ان کی گہری وابستگی کا بین ثبوت ہے۔

انیسویں صدی میں کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج کے قیام کے بعد بنگال کے تعلیمی ماحول میں زبردست بیداری آئی۔ عورتوں کے اندر بھی

حصول تعلیم کی خواہش بڑھنے لگی۔ پہلے وہ چوری چھپے پھر کھلے عام تعلیم حاصل کرنے لگیں۔ بنگال کی ابتدائی نثر نگاروں میں نجستہ اختر، سہروردیہ، راحت آراء بیگم کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔ راحت آرا بیگم کو بنگال کی بزرگ ترین خاتون افسانہ نگار ہونے کا شرف حاصل ہے۔ ان کے بعد صغریٰ سبزواری، صالحہ بیگم مخفی، شائستہ بیگم سہروردی نے تعداد کے لحاظ سے کم لیکن معیار کے اعتبار سے بہترین افسانے تخلیق کیے ہیں، لیکن میں یہاں اپنی بات شائستہ بیگم کے افسانوں تک ہی محدود رکھوں گی۔ اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ ابتدائی دور کی خواتین تحریروں میں اپنا نام منظر عام پر نہیں لاتی تھیں بلکہ کسی قلمی یا فرضی نام سے لکھا کرتی تھیں لیکن شائستہ بیگم کی انفرادیت یہ ہے کہ انھوں نے اپنے نام سے لکھا، کھل کر لکھا اور فخریہ لکھا۔

شائستہ بیگم سہروردی بنگال کی پہلی ڈاکٹریٹ خاتون افسانہ نگار ہیں۔ آپ کا تعلق بنگال کے تعلیم یافتہ خاندان سے تھا۔ ان کے والد لیفٹننٹ کرنل سرحسان سہروردی 1929ء سے 1934ء تک کلکتہ یونیورسٹی میں وائس چانسلر کے عہدے پر فائز رہے۔ 1933ء میں شائستہ بیگم کی شادی محمد اکرام اللہ سے ہوئی وہ انڈین سول سروس کے ممبر تھے۔ تقسیم ہند کے بعد وہ پاکستان منتقل ہوگئیں۔ ان کی پھوپھی نجستہ اختر بانو سہروری اپنے وقت کی مشہور ادیبہ تھیں۔ راحت آرا بیگم آپ کی خالہ تھیں۔ ان کی تحریریں آپ کو تقویت بخشتی تھیں۔ انھیں بچپن ہی سے علمی و ادبی ماحول میسر آیا۔ انھوں نے جلد ہی اردو لکھنے پڑھنے میں مہارت حاصل کرلی۔ گرچہ انھوں نے باقاعدہ عصری تعلیم انگریزی زبان میں حاصل کی۔ کلکتہ یونیورسٹی سے انگریزی ادب میں بی اے آنرز کا امتحان پاس کیا لیکن اردو زبان سے قلبی لگاؤ اور دلچسپی کی وجہ سے انھوں نے اس زبان میں خوب لکھا۔ انھوں نے اردو مضامین، افسانے، یادداشت، اور ایک ناول ''مہر آراء بیگم'' لکھا تھا جو رسالہ ''عصمت'' میں قسط وار شائع ہوا۔ پروفیسر شہناز نبی لکھتی ہیں:

> ''—— اردو میں شائستہ کے افسانوں کا مجموعہ ''کوشش ناتمام'' کے نام سے چھپا تھا۔ شائستہ کی ایک تصنیف ''سفر نامہ'' کے عنوان سے بھی منظر عام پر آئی تھی۔ علاوہ ازیں اردو اور انگریزی کے بیشتر رسائل و جرائد میں شائستہ کی تخلیقات شائع ہوئیں۔ انگریزی میں آپ کی تصانیف ''Behind the veil ceremonies, Customs, Letters to Neena, from Purdah to parliament(1963) and colours (1953)'' کافی مقبول ہوئیں۔ آپ نے اپنے بھائی حسین شہید سہروردی جو پاکستان کے پانچویں وزیر اعظم تھے کی سوانح بھی لکھی ہے۔ یہ کتاب 187 صفحات پر مشتمل ہے اور اسے آکسفورڈ یونیورسٹی پریس نے شائع کیا ہے—''

(فیمینزم: تاریخ و تنقید، شہناز نبی، ص:23، رہروانِ ادب پبلی کیشنز، 2012)

شائستہ بیگم سہروردی کا واحد افسانوی مجموعہ ''کوشش ناتمام'' 1950ء میں مکتبہ جدید لاہور سے شائع ہوا تھا جس میں گیارہ (11) افسانے شامل ہیں لیکن اس سرمایۂ مختصر میں بھی ان کی ذہانت جھلکتی نظر آتی ہے۔ کائنات، حیات کے حوالے سے ان کے تصورات، ان کے نظریات ان کے اسالیب روشن نظر آتے ہیں۔

انھوں نے لندن یونیورسٹی سے Development of the Urdu novel and short story نامی موضوع پر پی ایچ ڈی (Ph.D) کی ڈگری حاصل کی۔ شائستہ کو میکے اور سسرال دونوں جگہوں میں سیاسی، ادبی ماحول ملا، انھیں شادی کے بعد زندگی کی دوڑ میں آگے بڑھنے کے خوب مواقع ملے۔

افسانوی مجموعہ ''کوشش ناتمام'' کے بیشتر افسانوں میں عورت کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ شائستہ بیگم نے عورتوں کے مسائل اور ان کی سماجی حیثیت کا بغور مشاہدہ کیا ہے۔ اسی وجہ سے ان کی افسانوی دنیا محدود سی لگتی ہے لیکن اس حدود کے اندر اس کے تمام پہلوؤں کا خوب صورتی سے احاطہ کرتی ہیں۔ وہ جذبات و احساسات جو صنف نازک کو تڑپاتے اور رنجیدہ کرتے ہیں۔ یہ افسانے عورتوں کی زندگی کے ان مشکلات اور مسائل کو پیش کرتے ہیں جن پر انھیں مکمل عبور حاصل ہے جنھیں ایک مرد خوش اسلوبی سے پیش نہیں کرسکتا۔ مجموعے کا دیباچہ احمد علی نے لکھا ہے وہ لکھتے ہیں:

> ''یہ افسانے عورتوں کے ان جذبات سے تعلق رکھتے ہیں جن کو ہمارے ہاں کے مرد اکثر و بیشتر سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں اور جن کی بنا پر تلخی اور ناکامی کے احساس میں اتنا کچھ اضافہ ہوجاتا ہے۔ ہماری عورتوں کی زندگی درد انگیز اور رنج و محن سے بھری ہوئی ہے۔ ان کی اور مردوں کی زندگی میں نمایاں تضاد ہے۔ ہمارے مرد یا تو صحیح تعلیم کی کمی یا سوسائٹی کی دقیانوسی قدروں کے باعث عورتوں کے جذبات اور اس کی امنگوں اور خواہشات کو سمجھ ہی نہیں سکتے۔''

(کوشش ناتمام'' شائستہ بیگم سہروردی، ص:10، بار اول 1950، مکتبہ جدید لاہور)

حقیقت یہی ہے کہ جیسا کہ ان کی کہانی ''آزاد چڑیا'' سے گمان ہوتا ہے۔ افسانے کا مرکزی کردار ثریا ایک جدید تعلیم یافتہ لڑکی ہے۔ یہ

جوان اور زندگی سے بھرپور ہے۔ اس کے سینے میں آرزوؤں اور امنگوں کا طوفان موجود ہے۔ وہ اپنے شریک حیات کے ساتھ قید و بند کی بے کیف زندگی سے اکتا کر سیر و سیاحت کرنا چاہتی ہے لیکن اس کا شوہر اس سے بے توجہی اور بے التفاتی برت کر اپنی ساری توجہ نوکری اور ترقی پر صرف کرتا ہے۔ زندگی کے زریں لمحے جینے کا لطف، بیوی کی امنگیں، خوشی اور ارمان سب کچھ وہ اس مقصد کے لیے قربان کر رہا تھا۔ وہ حیلے بہانوں سے ہر سال اسے ٹالتا آ رہا ہے۔ ثریا اپنے چھوٹے سے گھر میں بولائی پھرتی ہے۔ اپنی اس بے کیف زندگی سے اکتا چکی تھی۔ حمید کے ساتھ قلبی تعلق قائم ہونے کے بعد وہ اپنے شوہر کو خلع کا نوٹس بھیجتی ہے۔ خلع کے ساتھ جو خط موصول ہوا وہ اس حقیقت کا مظہر ہے کہ آزادئ نسواں کی فضا عام ہو رہی ہے۔

ثریا کے اندر جو تبدیلی آئی ہے وہی اس کی سب سے بڑی طاقت ہے۔ اس عورت نے اپنے انکاری لہجے سے خود کو پہچانا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ خواتین کو ہمیشہ حاشیے پر رکھا گیا۔ ان کے جذبات و احساسات کو سمجھنے کی کوشش کی ہی نہیں گئی۔ ثریا خط میں لکھتی ہے:

> ''— جمیل اب میں واپس نہیں آ رہی۔ تمہارے ساتھ زندگی ناممکن ہے بلکہ تمہارے ساتھ جو پانچ سال میں نے گزارے وہ زندگی کے مترادف نہیں۔ زندگی نام ہے سیر کا تفریح کا زندہ دلی کا۔ ان میں سے کوئی بھی چیز تمہارے ساتھ مجھ کو میسر نہ آئی۔ تم میں اس کی اہلیت ہی نہیں اس کا احساس ہی نہیں۔ تن ڈھانکنے کے لیے کپڑا اور پیٹ بھرنے کے لیے روٹی کے سوا اور بھی کسی چیز کی ضرورت ہوتی ہے۔ شاید پہلے زمانے کی عورتوں کو اس کے سوا اور کسی چیز کی خواہش نہیں ہوتی ہوگی۔ نہیں ہوتی تو ضرور ہوگی لیکن اس کو یہ تعلیم دی جاتی تھی کہ یہ خواہش بے جا ہے۔ مجھ کو لکھایا پڑھایا گیا ہے کہ عورت بھی مرد کے ساتھ ساتھ زندگی کی دلچسپیوں میں حصہ لینے کی حق دار ہے۔ اس لیے جب وہ چیزیں مجھ کو نہیں ملیں تو میرے دل میں صبر کے بدلے بغاوت کا جذبہ پیدا ہوا اور تم نے مجھ کو قفس میں رکھا لیکن قفس کا دروازہ کھلا تھا اور اس قفس میں باغ کے جھونکے آنے لگے۔ میری پرورش آزادی کی فضا میں ہوئی۔ میں نے حقوق نسواں کی آرزوؤں میں ہوش سنبھالا تھا اس لیے میرے بال و پر میں اڑنے کی سکت باقی تھی۔ میں قفس کی چڑیا نہ تھی۔ قفس میں کیسے رہ جاتی—''

(افسانہ ''آزاد چڑیا'' ص:23)

مردوں نے عورتوں کو پڑھانے اور آزاد کرنے کے بعد بھی غلاموں کا سا سلوک کیا اور غلامی کوئی برداشت نہیں کر سکتا۔ انفرادی اور اجتماعی آزادی پر آج لوگ غلامی کے خلاف احتجاج کر رہے ہیں۔ پھر عورت اس کلیہ سے کس طرح مستثنیٰ ہو سکتی ہے۔

عورتوں کے معاملے میں یہ احساس ہمیشہ عام رہا ہے کہ ان کا دائرہ عمل صرف گھر کی چہار دیواری تک محدود ہے۔ ان سب سے اہم شعار شوہر پرستی اور سب سے اہم فریضہ بچوں کی تعلیم و تربیت ہے۔ ان حالات میں ان کا گھر کی چار دیواری سے نکل کر تعلیم حاصل کرنا اور سیاست میں حصہ لینا اور ایسے امور انجام دینا جو مردوں کے شانہ بہ شانہ ہوں تقریباً ناممکن سی بات تھی، حالانکہ جسمانی نابرابری کے باوجود قدرت نے عورت کو وہ صلاحیتیں بھی عطا کی ہیں جنھیں صرف مردوں کا اختصاص سمجھا جاتا رہا ہے۔ افسانہ ''نصف بہتر'' میں استانی کے کردار میں ایک ایسی تعلیم یافتہ مظلوم عورت نظر آتی ہے جس کی ترقی کی راہ میں اس کا تعلیم یافتہ شوہر حائل ہے۔ وہ اپنی نصف بہتر کو مختلف شعبۂ حیات میں نمایاں کامیابی حاصل کرتے دیکھ کر احساس کمتری کا شکار ہو جاتا ہے۔ سیاست میں اس کی ترقی و ترویج حسد کے جذبے کو پروان چڑھاتی ہے۔ وہ ذہنی تسکین حاصل کرنے کے لیے اپنی بیوی کو لے کر شہر سے گاؤں آ جاتا ہے تاکہ اس کی ترقی کی راہیں مسدود ہو جائیں۔ تنگ نظر، کم حوصلہ اور اعتماد سے عاری انسان اس استانی کی زندگی دوبھر کرنے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھتا۔ شائستہ بیگم استانی جی کی زبانی کہتی ہیں:

> ''—وہ اب بھی مجھ سے محبت کرتا تھا لیکن اس کی محبت سے زیادہ اس کے حسد کا جذبہ تھا کہ اس کو احساس کمتری تھا۔ اس کو خوف تھا کہ اگر اس نے مجھے ترقی کرنے دی تو میں اسے چھوڑ دوں گی حالانکہ اگر وہ مجھے کامیاب ہونے دیتا میرے دماغ کو ماؤف اور مجھے بے دست و پا کرنے کی کوشش نہ کرتا تو میری محبت کا درخت کبھی خشک نہ ہوتا—''

(افسانہ ''نصف بہتر'' ص:114)

استانی کی مظلومیت اور اس کی حسیت ایک نئی معیناتی قوس قزح کو ظاہر کرتی ہے۔ آج عورت اپنی شناخت اپنا تشخص چاہتی ہے۔ وہ ذاتی حقوق، آزادئ فکر و نظر اور کشادہ ذہن پر اصرار کرتی ہے۔ وہ اپنے مقام و مرتبہ کے حصول کی خواہش مند ہے۔ اس کی قدر شناسی اور قدر سنجی شائستہ بیگم مرد اساس معاشرے میں تلاش کرتی نظر آ رہی ہیں۔ وہ استحصال زدہ عورت کی جنگ کو ایک نئی طاقت عطا کرتی ہیں۔

شائستہ بیگم کے افسانے ایک مخصوص تہذیبی اور معاشرتی پس منظر میں لکھے گئے ہیں۔ زبان و بیان اور موضوعات کے اعتبار سے تانیثی رجحان کا ایک اہم نمونہ ہیں۔ سماجی اور معاشی دباؤ میں کچلی اور پسی ہوئی عورتوں میں ردِعمل، نفسیات، سوچ ان میں مکمل طور پر موجود ہے۔ سماجی جبر کی شکار ایک نازک سی لڑکی کی کہانی افسانہ ''مجرم'' میں موجود ہے۔ افسانہ کم عمری کی بے جوڑ شادی اور اس کے مہلک اور دوررس اثرات کا ایک غیر جانبدارانہ جائزہ ہے۔ عورت کی حرماں نصیبی اور زبوں حالی کو افسانے کا مرکزی موتیف بنایا گیا ہے اور امینہ کے کردار میں خواتین کے ساتھ روا غیر انسانی سلوک اور مردانہ سفاکی کی دلدوز اور رقت انگیز کہانی لکھی گئی ہے۔ نچلے طبقے کی کمین عورت کا اعلیٰ خاندان میں شادی کرنا ایک ایسا جرم ہے جس کو اعلیٰ طبقے والے کبھی معاف نہیں کرتے۔ افسانہ مروجہ، اخلاقیات، سماجی بندشوں اور معاشرتی امتناع کے خلاف پرزور صدائے احتجاج ہے۔ اعلیٰ خاندان میں کمسن امینہ کی شادی 42 سالہ مرد سے کروادی جاتی ہے اور شادی کے بعد شوہر کی جانب سے طرح طرح کی اذیتیں اور شکوک وشبہات تحفے میں ملتے ہیں۔ وہ اکثر و بیشتر جسمانی تشدد کا شکار ہوتی ہے۔ سسرالیوں کے طعنے، تشنے کوسنے، شکوک وشبہات الگ جان کو آتے ہیں۔ امینہ کو اپنے شوہر کی ہوئی حادثاتی موت کا الزام اور اس کے بعد جیل کی سزا بھی بھگتنی پڑتی ہے:

> ''— تیرہ، چودہ، پندرہ، سولہ برس کی عمر۔ چڑھتی جوانی، جن کے متعلق شعرا کا قول ہے کہ رنگین خوابوں کا زمانہ ہوتا ہے لیکن امینہ خواب بھی نہیں دیکھ سکتی کیونکہ اس کے خواب چھین لیے گئے تھے۔ جن لڑکیوں کی شادی سترہ اٹھارہ سال کی عمر میں ہوتی ہے وہ چند سال کم از کم خواب کی دنیا میں تو رہ لیتی ہیں۔ ان کو شوہر خواہ کیسا ہی برا ملے مگر وہ کچھ دن تو اپنی تخیل کی دنیا میں اچھی طرح گزار لیتی ہیں لیکن امینہ کو یہ بھی نصیب نہ ہوا۔ اس نے جوانی کی دنیا میں قدم رکھنے سے پہلے ہی قید و بند اور مصیبت و کلفت کا منہ دیکھا۔ اسے شیریں خواب کی اجازت بھی نہیں ملی۔'' (افسانہ ''مجرم'' ص:47)

شائستہ کے مذکورہ تینوں افسانے اس معاشرتی نظام کے حدود کو نشان زد کرتے ہیں جس نے مرد و عورت اور جذباتی و عقلی وجود کی تفریق روا رکھی ہے۔ یہ افسانے ایک ایسے معاشرہ کا نقشہ پیش کرتے ہیں جہاں عورت کی زندگی کے ہر شعبہ میں مرد کی دست نگر ہے۔ یہاں مرد کے ساتھ اس کے تعلق کے حوالے سے عورت کے رول کا تعین کیا جاتا ہے۔ چاہے وہ سماج ہو یا ملک کا قانون ہو یا مذہب۔ عورت کی کمتری کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ مردانہ قوت سے متصف نہیں ہے۔

شائستہ بیگم نے اپنی بیشتر کہانیوں میں عورتوں کی آزادی کی حمایت کی ہے۔ ان کی اکثر کہانیوں میں عورتوں کی خود مختاری کی طرف واضح اشارہ ملتا ہے۔ ان افسانوں میں فنی چابک دستی کے ساتھ اس حقیقت کی عکاسی کی گئی ہے کہ نسائی شعور کی فضا عام ہو رہی ہے۔ انھوں نے عورت کی شناخت، اس کے تشخص اور اس کی شخصیت کو مرد سماج کے حاشیے سے اٹھا کر مرکز میں لانے کی سعی کی ہے۔

انھوں نے عورتوں کے مسائل اور ان کی سماجی ہیئت کا بغور مشاہدہ کیا ہے۔ اسی مشاہدے سے یہ حقیقت آشکار ہوئی ہے کہ عورت فرمانبردار، خدمت گزار، وفا اور خلوص کا پیکر ہے۔ مختلف عمر کی عورتوں کی نفسیات وجذبات و احساسات کو انھوں نے بطور ایک عورت ہونے کے نہ صرف محسوس کیا ہے بلکہ بڑے سلیقے سے پیش بھی کیا ہے۔ افسانہ ''گوشۂ عافیت'' بظاہر ایک عام سے موضوع پر لکھا گیا ہے لیکن درحقیقت یہ افسانہ ان عورتوں کے لیے سماج کے دروازے وا کرتا ہے جو اپنے گھر کا سکون درہم برہم کر کے مہمانوں کی خاطر تواضع کرنے اور ان کے ناز نخرے اٹھانے میں خود کو ہلکان کرتی ہیں۔ غیروں اور نام نہاد عزیزوں کی خاطر داری اور دل جوئی میں اپنے اصل فرائض بھلا دیتی ہیں۔ نتیجہ صاف ظاہر ہے کہ گھر گوشۂ عافیت نہ ہو کر ہوٹل، سرائے کا روپ اختیار کر لیتا ہے۔ شوہر بچے سب ہی بے راہ روی کا شکار ہو جاتے ہیں وہ نہ شوہر کی رفیق رہتی ہیں اور نہ بچوں کی ہمدرد۔

افسانہ ''ہمدری'' میں غم گسار امینہ خاتون کے روپ میں گھر اجاڑنے والی عورتوں کی عکاسی کی گئی ہے جن کی ہمدردی سانپ کی طرح ان کے دوستوں کو ڈس لیتی ہے۔ یہ جس گھر میں جاتی ہیں وہاں رنج و غم تنازعے ڈیرہ جما لیتے ہیں۔ وہ گھروں کو تتر بتر کرنے میں خاصی مہارت رکھتی ہیں۔ ان کی کاٹ دار زبان گھروں میں لڑائی جھگڑے اور فساد کا باعث بنتی ہیں۔ یہاں ایک عورت دوسری عورتوں کے ہنستے بستے گھر کی بنیادیں ہلا دیتی ہیں۔ امینہ خاتون کی زبان کی تلخی اور کاٹ ملاحظہ کریں:

> ''اسے ہے بی معلوم نہیں تمہارا کیسا پتا ہے۔ میں ہوتی تو موؤں کو چیر کر رکھ دیتی (یا اگر اپنی اصلی طبیعت کے ماتحت نادرہ سوتیلے بچوں سے پیار سے بول لیتی) اور اس چڑیل کو ایسی سناؤں کہ چھٹی کا دودھ یاد آجاتے۔ تم ڈرتی کس بات سے ہو۔ حق تمہارا ہے۔ پہلی بیوی تم ہو۔ ہم تو عورتوں کی

کانفرنس میں ایسا ریزولیوشن پیش کرنے والے ہیں کہ جس کے ذریعہ دوسرا نکاح قانونی طور سے ناجائز قرار دیا جائے۔''

(افسانہ ''ہمدردی'' ص:143)

افسانہ ''تصویر کا دوسرا رخ'' ہمارے سماج میں پائے جانے والی ان عورتوں کی عکاسی کرتا ہے جو تعلیم یافتہ لیکن لالچی اور ظالم ہیں۔ ہم مردوں کی سفا کی اور ظلم کی داستان سنتے آئے ہیں لیکن شائستہ بیگم نے ہمارے معاشرے سے ایسی عورتوں کی کہانیاں بھی رقم کی ہیں جن کے ظلم و ستم کا سب سے زیادہ شکار اس کا شوہر ہوتا ہے۔ وہ اس کے جور و جبر کا تختۂ مشق بنا رہتا ہے۔ وہ عورت اس کے تمام مال و دولت پر قابض ہو کر اسے ایک کوٹھری میں قیدی بنا دیتی ہے۔ یہاں تک کہ موت ہی اسے اس قید سے نجات دلاتی ہے۔ خیالات اور طبیعتوں کا اختلاف دونوں کے درمیان حائل ہے۔ عزیز میاں تمام تر دولت، جائیداد، مکان، کھیت کھلیان کے مالک ہونے کے باوجود مفلس، حقیر، لاوارث رہے۔ مزید یہ کہ سلیمن کا کردار ان کی زندگی میں پریشانیوں کے باب وا کر دیتا ہے حالانکہ سلیمن سے ان کا تعلق ایک دل گرفتہ مظلوم انسان کی اور ایک انسان سے ہمدردی کی طلب سے زیادہ نہیں تھا لیکن بی بی فرخندہ نے خوب فائدہ اٹھایا شوہر کو بے وفا اور ظالم قرار دیا خود معصوم اور مظلوم ٹھہریں۔ افسانے کا ایک اقتباس دیکھیں کہ کس طرح دوسری عورت عزیز میاں کے غم کو سمجھتی ہیں:

''خیالات اور طبیعتوں کا ایک ہونا ضروری ہے۔ روپے سے کیا ہوتا ہے اور میں کب کہتی ہوں کہ ضروری نہیں یا روپے سے سب عیبوں پر پردہ پڑ جاتا ہے میں تو کہہ رہی ہوں کہ طبیعتوں کا اختلاف صرف ایک نہیں دونوں کے لیے سوہان روح ہوتا ہے۔ صرف فرخندہ ہی نہیں بلکہ عزیز میاں بھی دس بیس برس جلتے رہے ہاں جلے رہے۔ تم سمجھتی ہو صرف عورت جل سکتی ہے۔ صرف عورت ذات نفرت و حقارت کی ٹھوکریں کھاتی ہے..... بی بی اس بے چارے نے جتنا ظلم اٹھایا ہے کیا کوئی عورت اٹھائے گی۔''

(افسانہ ''تصویر کا دوسرا رخ'' ص:94)

افسانہ ''دو پھول ساتھ نکلے'' مٹتی ہوئی تہذیبی قدروں، رواں دواں زندگی اور اس کی دھول میں گم ہوتے رشتوں کا نوحہ ہے۔ افسانہ میں دادی کا کردار اپنی جانب متوجہ کرتا ہے۔ یہ دادی مضبوط، باوقار، عزم و ہمت کا پیکر ہے۔ اس کا اکلوتا بیٹا اپنی پہلی بیوی کی موت کے بعد (جو باوجود اپنی قربانیوں کے اسے ناپسند تھی) بے حد حسین عورت سے شادی کر کے اپنی الگ دنیا بسا لیتا ہے۔ اپنے تین بچوں کو اپنی ماں کے پاس چھوڑ جاتا ہے۔ یہ دادی تن تنہا ان تینوں بچوں کی پرورش و پرداخت کرتی ہے۔ وہ اپنی پوتی پوتوں کے لیے مضبوط اور مستحکم ہے کہ اپنے غم و اندوہ کی ہوا بھی کسی کو لگنے نہیں دیتی۔ اس کا بیٹا اعلیٰ تعلیم یافتہ اور اعلیٰ عہدے پر فائز ہے۔ وہ اپنی ماہانہ آمدنی سے نہایت قلیل رقم ہر ماہ پابندی سے بچوں کی تعلیم و تربیت کے لیے بھیج کر ہر فرض سے بری الذمہ ہو جاتا ہے۔ ایک لمبے عرصے کے بعد وہ جب اپنے بچوں اور ماں سے ملنے آتا ہے تو بچوں کے لباس اور وضع و قطع دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے۔ افسانے سے ایک اقتباس دیکھیں:

''کیا ان کے پاس اس سے اچھے کپڑے نہیں، اماں میں تمہیں ہر مہینے ان کے لیے روپیہ بھیجتا ہوں۔ بیٹے نے ذرا بلند آواز سے کہا اور ماں نے نرمی سے جواب دیا۔ 'ہاں بیٹا پچاس روپے ہر مہینے آتے ہیں۔ انہیں میں کنبہ کا لینا دینا بھی مجھ کو کرنا پڑتا ہے۔ تم تو پردیس میں ہو لیکن میں تو یہاں ہوں۔ خدا رکھے دو ہزار کے تنخواہ دار ہو۔ ہر شادی بیاہ میں اس کے حساب سے لینا دینا پڑتا ہے۔ سعادت مند بیٹے کی آواز بڑھیا ماں کی آواز سے اب اور زیادہ بلند تھی ''میں روپیہ ان واہیات کاموں کے لیے نہیں بھیجتا۔ بچوں کے کپڑے اور تعلیم کے لیے بھیجتا ہوں۔ بچوں کے کپڑے اور تعلیم پر ہی خرچ ہونا چاہیے تھا۔ لیکن پچاس روپیہ میں انہیں اس سے اچھے کپڑے نہیں پہنائے جا سکتے۔ ماں نے جواب دیا—''

(افسانہ ''دو پھول ساتھ نکلے'' ص:125)

جدید زندگی کی رنگینیوں اور دلچسپیوں نے بن ماں کے معصوم بچوں کو دہلی کی تنگ و تاریک گلیوں میں چھوڑ کر بالکل ہی بھلا دیا۔ ماں کی موت اور باپ کی بے اعتنائی بچوں کے اندر احساس محرومی و کمتری کے جذبات پیدا کر دیتی ہے۔

افسانہ ''شانتی'' معاشرے میں روا طبقاتی تفریق کو نشان زد کرتا ہے۔ شائستہ بیگم نے اس زمانے میں ابارشن جیسے مسئلے کو منظر عام پر لانے کی کوشش کی ہے کہ اس معاملے میں عورتوں کے ساتھ غیر مساوی سلوک کیا جاتا ہے۔ معاشرہ بڑا ظالم، سنگ دل اور منافق ہے۔ اس کے قوانین آہنی زنجیروں سے غریبوں کے ہاتھ پاؤں ان کی روحوں تک کو جکڑے ہوئے ہیں۔ لیکن اعلیٰ طبقے کی خواتین کی مرضی اور خوشی کے آگے یہ قوانین سرے سے کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ روپے کی کنجی سے وہ جب چاہیں اپنے جسم سے ناپسندیدہ وجود کو الگ کر سکتی ہیں اور انھیں ہر طرح کا تعاون ملتا

ہے لیکن شانتی ایک نچلے طبقے کی دیہاتی عورت ہے۔ وہ ہر جگہ منتیں کرتی ہے لیکن ناکام ہوجاتی ہے۔ سماج کے لعن طعن اور شوہر کے ظلم کے خوف سے اس کی موت واقع ہوجاتی ہے۔ شانتی کا رونا، چیخنا چلانا اور ڈاکٹروں کی منتیں کرنا سب ایک لیڈی ڈاکٹر کی نگاہوں کے سامنے گردش کرتے ہیں:

''میم صاحب! ڈاکٹر میم صاحب میں آپ کے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ پیر پڑتی ہوں۔ بھگوان کے لیے مجھ پر کرپا کرو۔ یہ پاپ میری جان سے دور کردو۔ میم صاحب میں تمہارے پیر پڑتی ہوں۔ میم صاحب میرا آدمی مجھے مار ڈالے گا۔ اس کی آنکھوں میں کتنا خوف تھا۔ کتنا ڈر تھا۔ کتنا زیادہ ڈر۔ وہ آنکھیں مجھے نہیں بھولتیں۔ اب بھی نہیں بھولتیں۔ اس کی چیخ اس جانور کی چیخ کی طرح تھی جس کے پیچھے شکاری آرہا ہو۔''

(افسانہ ''شانتی'' ص:149)

شائستہ بیگم نے ان افسانوں میں عورتوں کے مسائل اور حالات کی چیرہ دستیوں کو ایک نئے تیور اور نئے فکر و احساس کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ آج کے دور میں ان کے خیالات نئے محسوس نہ ہوں لیکن آج سے تقریباً ستر (70) سال قبل جب انھوں نے ان موضوعات پر قلم اٹھایا اس وقت ہمارے مرد اساس معاشرے میں لکھنے کی اجازت نہ تھی۔

□□□

Dr. Naghma Nigar
Guest Faculty
Dept of Urdu
Kazi Nazrul University
Asansol-713340 (W.B)
Phone: 8240752399
Email: naghmanigar703@gmail.com

Subscription Form "Mahnama Khwateen Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں 'ماہنامہ خواتین دنیا' کا/کی سالانہ خریدار بننا چاہتا/چاہتی ہوں۔

100 روپے کا ڈرافٹ/منی آرڈر ..... بتاریخ .....

بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زرِتعاون سالانہ -/100 روپے IFSC:CNRB0019009، A/C: 90092010045326 میں جمع کروادیا ہے۔

آپ 'ماہنامہ خواتین دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : .....

پتہ : .....

.....

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

E-mail:magazines@ncpul.in, 011-26108159: فیکس 011-26109746: فون

دستخط

ڈاکٹر گلشن آرا

پروفیسر اشرف جہاں
کے افسانوں میں انسان دوستی

اردو فکشن کی تاریخ خواتین کی خدمات کے بغیر ناممکن ہے۔ اردو کے افسانوی ادب کے حوالے سے جب ہم اس کا پوری سنجیدگی اور ایمانداری کے ساتھ تحقیق وتلاش کی منزلوں اور مرحلوں سے گزرتے ہیں تو اردو کی فکشن نگاری میں کہیں نہ کہیں خواتین کا نام آ ہی جاتا ہے۔ کہیں نام بدل کر، کہیں بنت اور کہیں شوہر نامدار کا لقب استعمال واختیار کر کے اپنی علمی وادبی صلاحیتوں کا ہر عہد میں مظاہرہ کرتی نظر آتی ہیں۔ یہ اس دور کی بات ہے کہ جب ہندوستان کا مسلم معاشرہ کئی مشکلات اور مصائب سے دوچار تھا۔ ہر طرف بے چین اور کرب کے ماحول میں زندگی گزارنے اور بسر کرنے پر مجبور تھے۔ 1857 کے بعد کے جو حالات پیدا ہوئے وہ سب تاریخ میں محفوظ ہیں۔ ان اذیتوں اور زیادتیوں کے باوجود مسلم عورتوں نے ہر محاذ و مقام پر مردوں کی نہ صرف ہمت افزائی کی بلکہ خود بھی حالات کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ سرسید کی اصطلاحی تحریک نے ایک نئی زندگی، نئی بصیرت اور نئی دنیا تازہ وجدید اذہان دے کر جو تاریخ رقم کی وہ آنے والی نسلوں کے لیے آج بھی مشعلِ راہ ہے۔ ہندوستان کی مسلم عورتوں نے بھی اسے لبیک کہا اور جدید تعلیم سے خود کو آراستہ و پیوستہ کر کے ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔ اردو فکشن کو سجاد حیدر یلدرم، سلطان حیدر جوش، پریم چند وغیرہ میں۔ یہ وہ عہد تھا، جب سخت پردہ کا رواج تھا اور عورتوں کا گھر سے باہر نکلنا بھی ممنوع تھا۔ ایسے ماحول میں بھی کچھ مسلم عورتوں نے قلم وقرطاس کے ذریعہ نہ صرف اردو کے افسانوی ادب میں قدم رکھا بلکہ علمی وادبی مضامین بھی لکھے اور اپنی عالمانہ و دانشورانہ صلاحیتوں کا بھرپور مظاہرہ کیا۔ کچھ گھر کی چہار دیواری میں قید رہ کر پرورش لوح وقلم کرتی نظر آتی ہیں تو کچھ اس سے آگے بڑھ کر مردوں کے شانہ بشانہ لکھنے پڑھنے میں مصروف ومنہمک نظر آتی ہیں۔ جدید تحقیق نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ کئی پردہ نشیں مسلم عورتوں نے اپنے علم سے معاشرہ میں پنپنے اور ان کی زندگی کے درد وداغ کا جس طرح انھوں نے اپنے افسانوں کے ذریعہ پیش کرنے کی مخلصانہ کاوش کی ہے وہ ہمارے افسانوی ادب کا نہایت ہی قیمتی سرمایہ ہے جسے ہم کسی بھی طور فراموش نہیں کر سکتے۔ نذر سجاد حیدر، حجاب امتیاز علی، عصمت چغتائی، شکیلہ اختر، سرلا دیوی، صالحہ عابد حسین، خدیجہ مستور، ہاجرہ مسرور، جیلانی بانو، ڈاکٹر رشید جہاں، ممتاز شیریں وغیرہ جیسی نہ جانے کتنی خواتین نے اردو کے افسانوی ادب کو مالا مال کیا۔ ان خواتین فکشن نگاروں میں ایک ایسا نام

بھی اُبھر کر سامنے آیا جس نے اردو کے افسانوی ادب کو عالمی ادب کے مد مقابل کھڑا کر دیا جس کی تخلیقات نے اردو کے نامور مرد فکشن نگاروں کے ہوش اڑا دیے جسے اردو دنیا قرۃ العین حیدر، یعنی عینی آپا کے نام سے جانتی اور پہچانتی ہے۔ سرزمین بہار نے بھی اسی عہد میں بھی بہت سے ایسے نام بھی نظر آتے ہیں جن کی اب تک وہ پذیرائی نہیں ہو سکی ہے جو ہونی چاہیے تھی۔ ایسی بہت سی خواتین اب بھی نظروں سے اوجھل ہیں جن کے بارے میں ہمیں تفصیل سے جاننے اور سمجھنے کی ضرورت ہے۔ اپنی بے پناہ صلاحیتوں کا بھرپور مظاہرہ کرتے ہوئے اردو کے افسانوی ادب کو اپنی تخلیقات سے ایک نئی تازگی و توانائی بخشی۔ دبستانِ عظیم آباد کی کئی نامور فکشن نگاروں نے اردو ادب میں ایک نئی تاریخ رقم کی ہے جسے ادبی دنیا کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ بہار کی افسانوی ادب کی تاریخ پر روشنی ڈالتے ہوئے نامور محقق و ادیب ڈاکٹر قیام نیر رقم طراز ہیں:

''بہار میں اردو افسانہ نگاری کی ابتد 1904 میں ہوئی۔ ایک تحقیق علی محمود کو اور دوسری تحقیق شاد عظیم آبادی کو اردو کا پہلا افسانہ نگار قرار دیتی ہے۔ حقیقت جو بھی ہو لیکن یہ سچ ہے کہ اردو افسانہ نگاری کی ابتدا ہی سے بہار کے افسانہ نگار اس صنف میں طبع آزمائی کرتے رہے ہیں۔ رومانی دور ہو یا حقیقت پسندانہ دور، ترقی پسندی کا دور ہو یا جدیدیت کا، مابعد جدیدیت کا دور ہو یا اکیسویں صدی کا۔ ہر دور میں بہار کے افسانہ نگار اپنے قلم کی جولانیاں دکھاتے رہے ہیں۔ بہار میں اردو افسانہ نگاروں کی اتنی بڑی تعداد ہے کہ ملک کی کسی دوسری ریاست میں شاید ہی اتنی بڑی تعداد ہو۔ ان لوگوں نے ہر طرح کے افسانے لکھے ہیں۔ گھریلو، قومی اور بین الاقوامی ہر طرح کے مسائل کو اٹھایا ہے۔ ماحول اور کردار کے مطابق زبان استعمال کی ہے۔ فن کا بھی بھرپور لحاظ رکھا ہے۔ اس لیے یہاں کے افسانہ نگاروں کے افسانے قوس وقزح کی حیثیت رکھتے ہیں''۔

(بہار میں تخلیقی نثر، آزادی کے بعد، صفحہ 16، جلد اول)

یہ ایک ادبی صداقت ہے کہ پروفیسر اختر اورینوی سے لے کر مشرف عالم ذوقی اور شکیلہ اختر سے ہو کر کوثر جہاں ایک لمبی فہرست بہار کے اردو افسانہ نگاروں کی ہمارے سامنے ہے۔

دبستانِ بہار کے افسانوی ادب پر خواتین افسانہ نگاروں میں باضابطہ سب سے پہلے جو نام ہمارے سامنے ابھر کر آتا ہے وہ نام شکیلہ اختر کا ہے۔ جنہوں نے اردو فکشن کی تاریخ میں وہ کارہائے نمایاں انجام دیے جو ناقابلِ فراموش ہے۔ صرف ایک افسانہ ''ڈائن'' میرے خیال میں انہیں زندہ رکھنے کے لیے کافی ہے۔ شکیلہ اختر کے بعد بہار میں خواتین اردو افسانہ نگاروں کی ایک لمبی فہرست ہمارے سامنے آتی ہے۔ ذکیہ مشہدی، امتیاز فاطمی، قمر جہاں، شمیم صادقہ، شہناز فاطمہ، شمیم افزا قمر، اشرف جہاں، تسنیم کوثر، نزہت نوری، اعجاز شاہین، کہکشاں انجم، نسرین بانو، ذکیہ خانم سکونتوی وغیرہ خواتین افسانہ نگاروں نے نہ صرف بہار بلکہ پوری اردو کی افسانوی دنیا میں اپنی ایک مخصوص و منفرد پہچان بنانے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ شاعری ہو یا فکشن نگاری یا دوسری اصناف ادب میں بھی بہار کی خواتین افسانہ نگاروں نے مقامی مسائل و معاملات سے لے کر قومی و بین الاقوامی سطح پر رونما ہونے والے واقعات و حادثات، معاملات و مصائب ہو یا کھیت کھلیان سے لے کر چھوٹے بڑے شہروں کی عام زندگی اور ان کے درد و داغ کو اپنے افسانوں کے وسیلے سے پیش کرنے کی مخلصانہ کاوشیں کیں۔ خواتین قلم کاروں کی ایک لمبی فہرست ہے۔ وہ شاعری میں ادا جعفری، زاہدہ حنا، فہمیدہ ریاض، کشور ناہید، خالدہ حسین، پروین شاکر، شاہدہ حسن، ڈاکٹر تنویر انجم نہ جانے کتنے ہی نام اردو شعر و ادب کے افق پر نہ صرف نمودار ہوئیں بلکہ عالمی سطح پر ان کی تخلیقات کو تحسین کی نظر سے دیکھا بھی گیا۔ حالانکہ خواتین قلم کار کو کئی مشکلوں اور پریشانیوں کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ بیمار زدہ ذہنیت و دیمک زدہ مسلم سماج، کھوکھلا معاشرہ اور فرسودہ روایات کی گٹھری سے باہر نکلنے میں انہیں تھوڑا وقت بھی لگا۔ ایک وقت وہ بھی آیا جب بقول ڈاکٹر فاطمہ حسن:

''1960 کی دہائی میں جب نسائی تحریک کو خواتین قلم کاروں کا ساتھ ملا تو ایک طرف تو ان کتابوں کے دوبارہ مطالعوں پر زور دیا گیا جن کو کلاسک کا درجہ حاصل ہے اور دوسری طرف خواتین کو تاریخ کے اندھیرے سے نکالنے پر توجہ دی گئی۔ نسائی تحریک نے مطالعہ کا رُخ بدل دیا ہے۔ اب سماجی علوم میں خواتین کو نظر انداز کرنا ممکن نہیں رہا ہے۔ تاریخ میں ان کی عدم شمولیت کو چیلنج کرنے کے ساتھ ساتھ جدید مورخین نے نہ صرف علم تاریخ کی تعریف متعین کرنے پر زور دیا ہے بلکہ خواتین مورخ اپنی تاریخ خود لکھنے کی طرف متوجہ ہوئیں''۔

(ادب میں صنفی تفریق اور خواتین قلم کار، مباحثہ، 37، صفحہ 15)

اب میں بہار کی ایک مشہور و معروف ادیبہ پروفیسر اشرف جہاں کی علمی و ادبی خدمات پر روشنی ڈالنے کی کوشش کروں گی۔ پروفیسر اشرف

جہاں 1970 کے بعد منظرِ عام پر آنے والی اہم خواتین افسانہ نگاروں کی صف میں ان کا شمار کیا جاتا ہے، ان کے افسانوں کا بنیادی محور و مرکز عورتوں کے مسائل و معاملات، ان کے درد و غم، گھریلو زندگی میں آنے والی پریشانیوں، ان پر ڈھائے جانے والے ظلم و ستم، ان کی ازدواجی زندگی میں ہونے والے حادثات، سانحات، واقعات و حالات کی بھرپور ترجمانی دیکھنے کو ملتی ہیں۔ اشرف جہاں کی تخلیقات میں جہاں ایک طرف کلاسیکی ادب کی خوشبو اور بدلتے ہوئے مزاج و میلان، ڈوبتے ابھرتے اور دم توڑتی انسانی قدروں کا زوال، ترقی پسند افکار و خیالات کے اثرات اور پھر جدیدیت اور مابعد جدیدیت کا رنگ و رامش بھی ہم آسانی سے تلاش کر سکتے ہیں۔

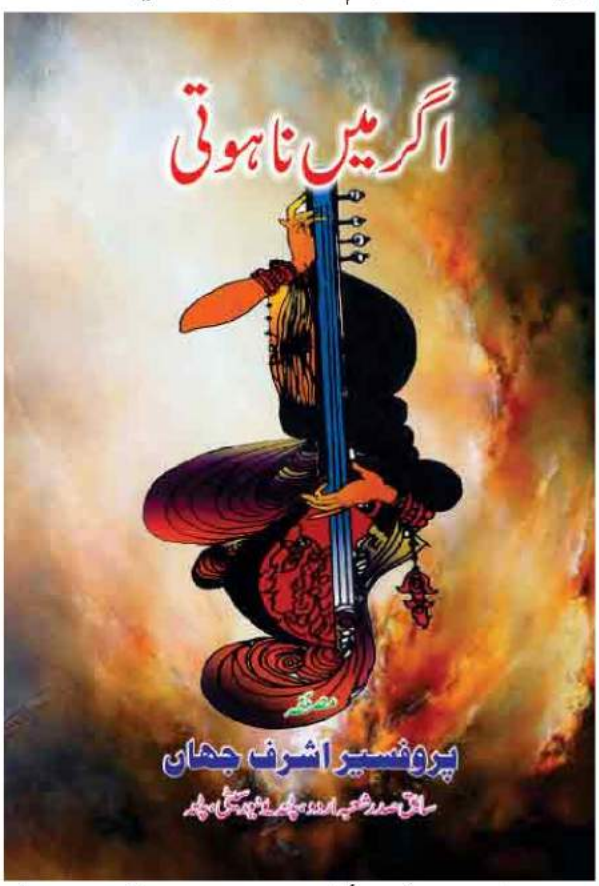

اشرف جہاں کی پیدائش 21 رجنوری 1951 کو ہزاری باغ، بہار میں ہوئی، مگر اصل وطن پٹنہ ہے۔ ابتدائی تعلیم و تربیت گھر کے پاکیزہ ماحول میں ہوئی۔ مذہبی و دینی تعلیم کے بعد انھوں نے 1965 میں میٹرک کا امتحان گورنمنٹ ہائی اسکول بھاگلپور سے، 1967 میں سندر وتی مہیلا کالج، بھاگلپور سے آئی اے، مہنت مہادیوانند مہیلا کالج آرہ سے، 1969 میں بی اے کا امتحان امتیازی نمبروں سے کیا، پھر پٹنہ یونیورسیٹی سے 1971 میں اردو میں ایم اے کرنے کے بعد 1987 میں یو جی سی اسکالر شپ ملی اور انھوں نے اپنا گرانقدر تحقیقی مقالہ بعنوان ''ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں میں کردار نگاری'' کے موضوع پر پروفیسر قریشہ حسین کی نگرانی میں مکمل کیا۔ ایم اے کی طالب علمی کے دور میں اپنے مشفق و محبوب اساتذہ پروفیسر اختر اورینوی، پروفیسر جمیل مظہری، پروفیسر مطیع الرحمٰن پروفیسر آصفہ واسع وغیرہ اساتذہ نے ان پر گہرے نقوش چھوڑے۔ ان عظیم اور ہر دلعزیز اساتذہ کی علمی و ادبی تربیت اور ذہنی آبیاری نے اشرف جہاں کو شعر و ادب کی وادیوں سے قریب تر کر کے لکھنے پڑھنے کا صاف و ستھرا ذوق و شوق ان کے اندر پیدا کیا۔ اساتذہ کی بے پناہ شفقتوں اور محبتوں نے اشرف جہاں کے اندر چھپتے ہوئے علم و ادب کے جوہر و گوہر کو باہر نکالنے کی کامیاب کوشش کی۔

1981 میں گورنمنٹ کالج، گردنی باغ، پٹنہ میں بحیثیت اردو لیکچرران کی ملازمت کا آغاز ہوا اور ترقیات کی منزلوں کو طے کرتے ہوئے 1987 میں پٹنہ کالج اور پھر 2011 میں صدر شعبہ اردو، پٹنہ یونیورسٹی ہوئیں۔ 31 رجنوری 2016 میں سبکدوش ہو کر 18 اگست 2020 کو ان کی وفات ہوئی۔ اور اس طرح اردو شعر و ادب کا ایک نہایت ہی خاموش و خوبصورت درخشندہ ستارہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دنیا سے رخصت ہو گیا۔

پروفیسر اشرف جہاں کی علمی و ادبی زندگی کا آغاز 1962 میں ہند چین جنگ کے موضوع پر لکھا ہوا ان کا افسانہ 1965 میں منظرِ عام پر آیا۔ ان کے تین افسانوی مجموعی ''شناخت'' 1997، ''اکیسویں صدی کی نرملا ''2009 اور ''اگر میں نا ہوتی'' 2018 کے علاوہ دو تحقیقی و تنقیدی کتابیں ''شاد عظیم آبادی کے ناول''، ''صورت الخیال ولایتی کی آپ بیتی کا تنقیدی جائزہ'' اور ''افسانے کا بدلتا مزاج'' خاص ادبی اہمیت و عظمت کے حامل ہیں۔ ایک انشائیوں پر مشتمل مجموعہ بعنوان ''ہم اردو کے ٹیچر ہوئے'' 2005 میں شائع ہوئی۔ پروفیسر اشرف جہاں کا ایک نہایت ہی اہم ادبی و تحقیقی کارنامہ ''اردو ناول کے آغاز میں عظیم آباد کا حصہ'' سنگ میل کا درجہ رکھتے ہیں۔ پروفیسر اشرف جہاں کا شمار اردو کے ان ادیبوں و دانشوروں میں ہوتا ہے جنھوں نے اپنی پوری زندگی اردو شعر و ادب کی آبیاری میں گذار دی بغیر کسی نام و نمود، صلے و ستائش سے بلند و بالا ہو کر انھوں نے اردو کے افسانوی ادب میں خواتین کی خدمات کے باب میں ایک اضافہ کیا ہے۔ ڈاکٹر اشرف جہاں کے افسانوں میں انسانی زندگی کے کرب و کیف، درد و داغ، ڈوبتے ابھرتے زندگی اور زمانے کی عکاسی، عورتوں کے ساتھ ہونے والے ظلم و زیادتی، ان کی زندگی میں رونما ہونے والے ان تمام کیفیات و واقعات کو نہایت ہی خوبصورتی اور خوش اسلوبی کے ساتھ انھوں

نے اپنے افسانوں کے ذریعے پیش کرنے کی مخلصانہ کاوشیں کی ہیں۔ ''موم کی مریم'' کا یہ اقتباس بطور خاص ملاحظہ ہو:

''میں نے تمہیں اس دلدل میں گرتا دیکھا تو بچانا چاہا۔ میری عمر اور تمہاری عمر میں کافی تضاد تھا، سوائے نکاح کے اور کون سا راستہ اختیار کرتا تاکہ تمہاری حفاظت ہو سکے۔ اور بہت سوچنے کے بعد میں نے وہی کیا۔ اب میں نے تمہارے لئے تمہارے مطابق کا لڑکا ڈھونڈ لیا ہے، اسے سب کچھ بتا دیا ہے۔ جانتی ہو کون؟ ڈاکٹر حامد۔ تم تو اس سے مل بھی چکی ہو۔ میں نے اسے یقین دلایا ہے کہ تم مریم کی طرح پاکیزہ ہو۔ وہ نکاح صرف تمہاری حفاظت کے لیے تھا۔ اور جانتی ہو ڈاکٹر حامد میری باتوں پر یقین کرتا ہے۔ میں تین طلاق دے کر اس سے بیاہ دوں گا''۔

مجھے اس کا اعتراف کرنے میں کوئی تامل نہیں کہ پروفیسر اشرف جہاں کا علمی و ادبی مقام و مرتبہ قرۃ العین حیدر، جیلانی بانو، عصمت چغتائی، شکیلہ اختر وغیرہ اس صف میں نہیں، مگر پروفیسر اشرف جہاں نے اردو کے افسانوی ادب کو جو کچھ دیا ہے وہ ہماری جدید اردو ادب کا ایک سنہرا باب ہے۔ انھوں نے پوری دیانت، خلوص اور علمی و ادبی فرائض کو انجام دینے کی کامیاب کوشش کی ہے، ان کے افسانے روز مرہ کی زندگی کے مسائل و معاملات، ٹوٹتے، بکھرتے گھر اور گھرانہ، عام عورتوں کی زندگی میں آنے والی چھوٹی، بڑی مصیبتوں اور پریشانیوں، ان کی چیخ پکار اور ان کے آنسو و آہ و فغاں اور عورتوں کی نفسیاتی درد و غم، دکھ سکھ، الجھنیں اور وہ سب کچھ جو ایک عام عورت کی زندگی میں رونما ہوتے ہیں ان تمام کیفیات و حالات کی بھرپور عکاسی و ترجمانی اشرف جہاں کے افسانوں میں دیکھ اور تلاش کر سکتے ہیں۔ انھوں نے جدید اردو کے افسانوی ادب کو زمینی حقیقتوں اور صداقتوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے عورتوں کی عام زندگی کو اپنے افسانوں کا مرکز و مسکن بنا کر پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی۔ عورتوں کا جنسی استحصال، جہیز کی لعنت، شادی بیاہ میں ہونے والے لین دین، عورتوں کا تحفظ اور خود عورتوں کے ذریعہ عورتوں کا استحصال، یہ تمام رنگ و رامش ہمیں اشرف جہاں کے افسانوں میں بدرجۂ اتم دیکھنے کو ملتے ہیں۔

افسانہ ہو یا انشائیہ، تحقیق ہو یا تنقید ہر میدان میں انھوں نے ادب کے وقار و معیار کو بلند کیا۔ سماج میں عورتوں کی ہنستی، بولتی، ڈوبتی، ابھرتی اور دم توڑتی ہوئی ان کی زندگی اور زمانے میں اخلاقی تہذیبی اور معاشرتی گراوٹ کو انھوں نے اپنی تخلیقات کے ذریعہ پیش کرنے کی مخلصانہ کاوشیں کیں، بقول نامور ناقد و شاعر پروفیسر علیم اللہ حالی:

''بیشتر کہانیاں متوسط طبقے میں عورتوں کی بے بسی کی روداد پیش کرتی ہیں۔ روایتی انداز کی خامیوں کی نشاندہی بھی ہے، جس کی وجہ سے عورتیں مظالم کو مقدر سمجھ لیتی ہیں۔ یہاں نسائی تحریک کی بپھرتی لہریں تو نہیں، لیکن نئے تہذیبی ڈھانچے میں عورتوں کو اپنے مقام اور مرتبے کا بار بار احساس دلانے والی کہانیاں ایک انقلاب کی شائستہ ترغیب دیتی ہوئی نظر آتی ہیں''۔

(بہار کی یونیورسٹیوں میں اردو زبان و ادب، از ڈاکٹر احمد صغیر، صفحہ 71)

□□□

Dr. Gulshan Ara
W/o Dr. Khaliqur Rahman
Madrasa Road
Maripur,
Muzaffarpur-842001 (Bihar)
Mob.: 7070223675, 9934635175

ڈاکٹر محمد یونس ٹھوکر

عصمت چغتائی کی مکتوب نگاری

عصمت چغتائی کے نام اور کام سے شاید ہی اردو ادب کا کوئی ذہین وفتین قاری بے خبر ہوسکتا ہے۔ اردو ناول نگاری کے آسمان پر ان کا نام ہمیشہ ایک درخشاں ستارے کی مانند چمکتا رہے گا۔ عصمت چغتائی نے ناول کے میدان میں اپنی شہرت اور مقبولیت کے جھنڈے کچھ اس طرح گاڑھ دئے کہ اس کی شہرت اور گونج کے نیچے ان کی دیگر تخلیقی کاوشات دبی نہ صحیح لیکن ماند ضرور پڑ گئیں۔ بہت کم قارئین ادب اس بات سے واقف ہوں گے کہ عصمت چغتائی ایک بہترین ناول نگار اور افسانہ نگار کے ساتھ ساتھ ایک بہترین مکتوب نگار بھی ہیں۔ یہ الگ سوال ہے کہ مکتوب نگاری میں ابھی تک انھیں وہ مقام اور مرتبہ نہیں مل سکا جس کی وہ متحمل ہیں۔ اس بات کے ذمہ دار شاید اردو ادب کے محققین ہیں جو مکتوب نگاری کے حوالے سے ابھی تک تحقیقی مقالات سامنے نہیں لاسکیں ہیں۔ اگر ایسا ہوا ہوتا تو یقیناً ان کی مکتوب نگاری آج تک نظروں سے اوجھل نہ رہتی۔

یہ الگ بات ہے کہ ان کے خطوط غالب کے خطوط کے مقابل میں نہیں رکھے جاسکتے ہیں لیکن ایسا بھی نہیں کہ تاقِ نسیاں میں رکھ کر قطعی طور پر ان سے صرف نظر کیا جائے۔ اُن خطوط کی اپنی ایک ادبی قدر و قیمت ہے جس کا اندازہ انہیں زیر مطالعہ لانے کے بعد ہی ہوتا ہے۔ اُن خطوط کا جب باریک بینی سے مطالعہ کیا جاتا ہے تو ہمیں عصمت چغتائی کے حوالے سے بہت ساری نئی معلومات کا انکشاف ہوتا ہے۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ اردو ادب میں خطوط نگاری اپنی ایک مستقل صنفی حیثیت رکھتی ہے۔ لہذا ایسے میں ایک ذمہ دار محقق اور نقاد کا فرض ہے کہ وہ ان خطوط کو بھی ادبی سطح پر پرکھنے سے گریز نہ کرے۔

خطوط نگاری کیا ہے؟ اور اردو ادب میں اس کی اہمیت اور افادیت کیوں کر مسلم ہے پہلے یہ جان لینا ضروری ہے۔ اپنے وسیع ترین ادبی خصائص کی بنا پر خطوط نگاری اردو ادب کی ایک ہر دل عزیز صنف کی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔ مکتوب نگاری کی اپنی ایک قدیم تاریخ ہے۔ مکتوب نگاری اپنے تاریخ میں کن کن ارتقائی مراحل سے گزری یہ ایک بحث طلب

موضوع ہے اور اس موضوع کو سمیٹنے کے لیے بحر بے کراں کی ضرورت ہے۔ پرانے زمانے میں، جب مواصلاتی دنیا اتنی ترقی کے منازل طے نہیں کر چکی تھی، یہی ایک واحد ذریعہ آپسی تعلقات اور روابط کا تھا کیونکہ دو اشخاص کے مابین اپنے خیالات کی ترسیل ایک سماجی ضرورت ہے۔ اور جب یہی ضرورت بالمشافہ ممکن پزیر نہ ہو انسان اسی خط کا سہارا لے کر اپنے خیالات اور احساسات کو دوسرے تک منتقل کرنا ممکن بناتا ہے۔ خط دراصل تحریری گفتگو کا دوسرا نام ہے۔ خطوط نگاری نثری ادب کی ایک باقاعدہ صنف کی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔ خورشید الاسلام نے اس حوالے سے اپنی کتاب ''تنقیدیں'' میں بجا طور پر فرمایا ہے:

> ''خط حسن اتفاق کا نام ہے اور حسن اتفاق ہی سے یہ ادب کی ایک صنف ہے۔ اچھے خط ادبی کارنامے ہوتے ہیں۔ خط چھوٹی چھوٹی باتوں سے بنے جاتے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی باتوں ہی میں دنیا کا لطف ہے۔ زندگی میں لمحے قیمتی ہوتے ہیں۔ ان لمحوں کو زندگی کے دامن سے چرا لینا، محفوظ رکھنا اور رازداروں میں تقسیم کر دینا، یہ ہی حسن عمل ہے یہی تخلیق ہے اور یہی نجات ہے۔''

زمانہ برق رفتاری سے آگے بڑھتا گیا اور ان خطوط کی جگہ مواصلاتی دنیا کی جدید ٹیکنالوجی کے ذرائع ابلاغ نے لی۔ فیس بک، برقی پتہ (email)، واٹس ایپ وغیرہ جیسے ابلاغی ذرائع نے فن خطوط نگاری کو کافی حد تک نقصان پہنچایا۔ لیکن تاریخ کے ہر دور میں ادیبوں کی ایک کھیپ نے اس فن کو زندہ جاوید رکھنے کے لیے ہر ممکن کوشش کی۔ پیش نظر عصمت چغتائی کے خطوط بھی اسی کاوش کی ایک دلیل ہے۔

اسی تناظر میں اگر عصمت چغتائی کی مکتوب نگاری کا جائزہ لیا جائے تو یہ بات بالکل صاف طور پر عیاں ہوتی ہے کہ ان کی ادبی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے۔ پہلی بات یہ ہے کہ انھوں نے کئی ایک خطوط ایسے لکھے جو مختلف رسائل و جرائد کی زینت بن گئے۔ اس ضمن میں سر دست رسالہ ''نقوش'' کے افسانہ نمبر ستمبر، اکتوبر 1952 کا ذکر کرنا لازمی بن جاتا ہے جس میں موصوفہ کے تقریباً آٹھ خط شائع ہو چکے ہیں۔ واضح رہے کہ یہ مختلف مدعوں پر لکھے گئے خطوط ہیں اور ان سب خطوط کا مکتوب الیہ اخلاق صاحب ہیں۔ پہلا خط اخلاق صاحب کے نام ایک جوابی خط ہے۔ اپنے بھائی عظیم بیگ چغتائی کی وفات پر جو تعزیت اخلاق صاحب نے ان سے خط کے ذریعے پوچھی تھی یہ خط اسی تعزیت پرسی کے جواب میں لکھا گیا ہے۔

دوسرے خط میں شاہد لطیف کی شادی کے حوالے سے عصمت چغتائی نے بھرپور تعاون کرنے کا وعدہ کیا ہے۔ تیسرا خط بھی انھیں کے نام ہے جس میں عصمت چغتائی نے جودھ پور سے ممبئی جانے کا ذکر کیا ہے۔ اپنے چوتھے خط میں جہاں انھوں نے اپنے ناول ''ضدی'' پر لب کشائی کی ہے وہیں انھوں نے اخلاق صاحب کو ممبئی کی معاشرتی زندگی سے بھی کسی حد تک آگاہ کیا ہے۔ اپنے پانچویں خط میں عصمت چغتائی نے اخلاق صاحب سے کسی ایک مضمون کی فرمائش کی ہے جسے وہ اپنے رسالے ''تاجور'' میں شائع کرنا چاہتی ہیں۔

چھٹا خط بھی جیسا کہ ذکر کیا جا چکا ہے کہ اخلاق صاحب ہی کے نام ہے۔ اس خط میں انھوں والہانہ انداز میں اخلاق صاحب کے بھیجے گئے مضمون پر اپنا تبصرہ پیش کیا ہے اور اپنے چند ایک مفید مشوروں سے بھی مستفید ہونے کا موقع دیا ہے۔ بطور مثال چند سطور ملاحظہ ہوں:

> ''پیارے دیور صاحب مضمون ملا۔ عنوان اس قدر گہرا ہے کہ اگر ناولیں لکھی جائیں تو بھی تہہ نہ ملے۔ یوں کیجئے کہ اس مضمون کو برباد نہ کیجئے۔ بہت ہی لطیف چیز لکھی جا سکتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ لکھتے لکھتے شرما گئے۔ اور بتانے والی بات ٹال گئے۔ آپ اسٹیشن گئے وہاں ''سر بند پارسل'' ملی۔

پھر؟ پھر کیا ہوا۔ یقین مانئے آپ کی عزت پر حرف نہ آئے گا۔ آپ بتا دیجئے کہ پھر کیا ہوا۔ یوں بات موڑ توڑ کر گول کر گئے۔ آپ نے مضمون بہت اچھا لیا ہے۔.....''

ساتواں خط بھی پانچویں خط سے کسی طرح مختلف نہیں۔ اس میں بھی مضمون بھیجنے کے ساتھ ساتھ رسالے کے سلسلے میں تعاون کی اپیل کی گئی ہے۔ آٹھویں خط میں انھوں نے اخلاق صاحب کے اس التماس کی حامی بھری ہے جو انھوں نے شاہد صاحب پر مضمون لکھنے کی مانگ کی تھی۔

عصمت چغتائی کے خطوط کا مطالعہ کر کے ان کی نجی زندگی کے مختلف گوشے سامنے آتے ہیں۔ ان کی ازدواجی زندگی کے بہت سارے معاملات ہم پر وا ہو جاتے ہیں۔ شاہد لطیف کے ساتھ ان کے ازدواجی تعلقات کس نوعیت کے تھے اس کی جانکاری بھی ہمیں ان خطوط کے ذریعے فراہم ہوتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ شاہد لطیف کے ساتھ ازدواجی رشتے میں بندھنے سے مطمئن نظر آتی ہیں۔ وہ اپنے مقابل میں شاہد لطیف کی شرافت کو فوقیت دیتے ہوئے ان کی منکسر المزاجی کا صمیم قلب سے اعتراف کرتی ہے۔ 'نقوش خطوط نمبر' اپریل، مئی 1968 میں منظر عام پر آیا۔ اس میں عصمت چغتائی کے چھ خطوط واجدہ تبسم کو مخاطب کر کے شائع ہوئے ہیں۔ اپنے چوتھے خط میں انھوں نے واجدہ تبسم کے ساتھ شاہد لطیف کے تعلق سے انہی خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ملاحظہ ہوں:

''ہم دونوں کی شادی بے حد کامیاب ہے۔ کیونکہ سوائے بچوں کے کوئی مروت ہمارے درمیان نہیں بہت کم ایک دوسرے سے شکایت پیدا ہوتی ہے۔ میں ذرا لوگوں میں گھسنے کی عادی ہوں مگر شاہد بڑے کم سخن ہیں۔ ہم دونوں میں کروڑوں میل کا فاصلہ ہوتے ہوئے بھی کچھ زیادہ دوری نہیں۔ بڑا لطیف رشتہ ہے ہمارا۔ مجھے تو نہ دنیا کا ڈر ہے نہ دین کا پھر بھی ساتھ رہتے ہیں۔ کچھ کوفت نہیں ہوتی (Tolerance) میری جان ایک ایسی ضروری چیز ہے جس کی مدد سے آپ سب کچھ کر سکتے ہیں اور پھر مجھ میں کون سے لعل جڑے ہیں۔ میں بھی ماشاللہ کافی نکمی ہوں شاہد شراب خانہ میں دھر لیے گئے۔ میں نے صرف جملہ بازی کی۔ بخدا غصہ نہیں آیا۔ لوگ متعجب ہیں کہ میں جو چڑی کی دگی پر مر بیٹھے ہوں جو راہ چلتوں سے الجھتی ہوں۔ شاہد کی زندگی کیوں نہیں حرام کر دیتی۔''

نقوش میں شائع ہونے والے عصمت چغتائی کے ان خطوط سے ہمیں ان کی معاشی حالت کا بھی مبینہ طور پر پتہ چلتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ شاہد کے انتقال کے بعد ان کی معاشی حالت بہت ناگفتہ بہ رہی ہے۔ لیکن خودداری کا عالم یہ تھا کہ کسی ایک پر بھی اپنی کسمپرسی ظاہر نہیں ہونے دی۔ نہ کسی کے سامنے دست سوال دراز کیے۔ عصمت چغتائی کی معاشی و معاشرتی زندگی سے جڑے بہت سارے معاملات مشکوک اور اختلاف فیہ ہیں لیکن اگر ان کے خطوط کا صحیح طور سے مطالعہ عمل میں لایا جائے تو یہ سارے معاملات بڑی آسانی کے ساتھ حل کیے جا سکتے ہیں۔ ذیل میں ایک ہی خط کے دو اقتباسات درج ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں کہ ان دو اقتباسات میں کس قدر صاف اور شفاف الفاظ میں عصمت چغتائی نے اپنی معاشی حالت کا اظہار اپنی قلمی دوست واجدہ تبسم سے کیا ہے:

سٹرن! تم مجھے امیر کیوں سمجھتے ہو۔ مجھے تو پیسے کی بڑی قلت رہتی ہے۔ بہت سا قرضہ ہے۔ ڈھائی سو مکان کا کرایہ کئی کئی ماہ کا چڑھ جاتا ہے۔ میں اور شاہد دونوں مل کر کماتے ہیں پھر بھی کڑکی آتی رہتی ہے۔ میرے بینک میں اس وقت ایک سو چھبیس روپے ہیں۔ گھر کا خرچہ دو ہزار مہینہ ہے۔ دنیا کے کوئی عیش نہیں کرتی صرف ڈیڑھ روپیہ کے ٹکٹ سے سینما دیکھتی ہوں اور ایک نیا پیسہ پوئنٹ سے رمی کھیلتی ہوں۔''

''مجھے شاہد کی مدد کے بغیر اپنی دو بچیوں کو سنبھالنا تھا۔ سیما نے شادی کر لی تھی۔ شاہد چل دیے۔ ان کے پاس موت کے وقت سات روپے تھے۔ میں نے کیسے ان کے کفن دفن کا خرچہ نکالا میں ہی جانتی ہوں۔ شاہد نے فلموں کے سارے کاغذات اپنے کسی دوست کو دے رکھے تھے۔ وہ کون تھا مجھے پتہ نہ تھا۔ پانچ فلموں سے مجھے کوڑی نہ ملی۔ میں کچھ نہ کر سکی مگر میں نے گھر میں پے انگ گیسٹ رکھ کر دو وقت کی روٹی کا انتظام کر لیا۔ چند سال میں نے کیسے گزارے میں ہی جانتی ہوں، مگر نہ میری آنکھ سے آنسو نکلا نہ میں نے کسی سے شکایت کی اور نہ مدد مانگی۔ میں نے صرف چند سفید ساڑیوں کو لانڈری سے دھلوا دھلوا کر عام جلسوں میں شرکت کی اور میرے کھلے ہوئے چہرے کے پیچھے جو کرب چھپا تھا اسے میں نے کسی پر ظاہر نہ ہونے دیا۔''

ایسا نہیں کہ ان کے خطوط صرف ان کی نجی اور گھریلوں زندگی کی معلومات فراہم کرنے تک ہی محدود ہیں بلکہ بایں ہمہ عصمت چغتائی کے خطوط میں ہمیں ان کے ناقدانہ شعور کا بہت حد تک پتہ چلتا ہے۔ مختلف

رسائل وجرائد کے مدیر صاحبان کے نام ان کے خطوط جو ہمیں پڑھنے کو ملتے ہیں ان کے بین السطور میں انھوں نے جو افسانہ نگاروں کی تخلیقی کاوشات پر اپنی بے لاگ رائے کا اظہار کیا ہے وہ ان کی تنقیدی بصیرت کا پتہ دیتے ہیں۔ان خطوط کا مطالعہ کرنے سے یہ بات صاف پتہ چلتی ہے کہ عصمت چغتائی تنقید کے منصب سے خوب اچھی طرح واقف ہیں۔وہ اپنے لکھے گئے خطوط میں ناقدین ادب پر مختلف فقرے کستی ہیں۔وہ آج کل کے ناقدین سے کسی قدر مایوس نظر آتی ہیں۔کیونکہ ان میں تنقیدی بصیرت اور ادب فہمی کی وہ گہرائی اور گیرائی ہی نہیں جو ادیبوں کے لیے مشعل راہ ثابت ہو۔وہ تنقید کے میدان میں تنافر اور تکرار سے سخت بیزار نظر آتی ہیں۔آجکل کے ناقدوں پر عصمت چغتائی نے اپنے ایک خط میں یوں تبصرہ پیش کیا ہے:

''.....ویسے تنقید نگار کسی افسانہ نگار یا اس کے افسانے کو لے کر تنقید نہیں کرتے۔اس کی اچھائی اور کمزوری پر ایسی رائے نہیں دیتے جو لکھنے والے کو کسی قسم کی مدد دے سکے۔..... چلتے چلتے وہی پرانے جملے دہراتے ہیں۔فلاں فحاشی ہے، فلاں کے یہاں گیرائی، فلاں کے یہاں رجعت پسندی پائی جاتی ہے اور فلاں نعرے بازوں کی فہرست میں آتا ہے۔ کیوں؟ اس پر کوئی روشنی نہیں ڈالتا کہ یہ راستہ منزل کی طرف جاتا ہے اور اس راستے میں یہ خطرے ہیں۔''

بعض خطوط ان کے ایسے بھی ہیں جنھیں پڑھ کر ہم ان کے اس نظریے سے بھی واقف ہوتے ہیں جو یہ عظیم ناول نگار اپنے ہم عصر ادیبوں یا شاعروں کے تئیں رکھتی ہیں۔واضح رہے کہ ایسی نادر معلومات ان کے ناولوں یا افسانوں کو پڑھ کر حاصل نہیں کی جاسکتی ہے کیونکہ وہاں ہر چیز بناوٹی ہوتی ہے۔تخیل کی کارفرمائی جابجا ہوتی ہے۔اس کے علی الرغم خطوط انسان کے مافی الضمیر کو پیش کرتا ہے۔یہ بناوٹ اور تصنع کاری سے بہت حد تک عاری ہوتی ہے۔یہاں چیزوں کے تئیں انسان کا نظریہ کسی قدر واضح اور کھل کر سامنے آتا ہے۔مثال کے طور پر جوش کے متعلق عصمت چغائی کا یہ نظریہ:

''جوش صاحب زندگی میں بھی ویسے ہی چاق و چوبند اور گرجدار نظر آتے ہیں جیسے اپنی شاعری میں۔''

جدید تنقیدی مطالعات کی روشنی میں ہم عصمت چغتائی کو ایک بے باک تانیثی فکشن نگار مانتے ہیں۔ان کے ناولوں پر تانیثی تنقید کے تناظر میں بہت کچھ تحقیقی نوعیت کا کام ہوا ہے۔کیا عصمت چغتائی واقعی اپنا کوئی تانیثی نظریہ رکھتی بھی تھیں یا نہیں؟ ان کے فکشن پاروں کا مطالعہ کرنے سے یہ بات قطعیت کے ساتھ نہیں کہی جاسکتی ہے۔نیز یہ بات بھی ٹھوس حقائق کی روشنی میں ثابت نہیں کی جاسکتی ہے کہ ان کے خیالات تانیثیت کے کس اسکول کی نشاندہی کرتے ہیں، لبرل یا شدت پسند۔لیکن ان کے خطوط ان کے تانیثی نظریہ کو کسی قدر واضح طور پر سامنے لاتے ہیں۔ذیل میں ایک خط کا اقتباس درج ہے جس میں موصوفہ کا تانیثی شعور مغرب کے شدت پسند تانیثی نظریہ سے بگل گیر ہوتا ہوا نظر آتا ہے:

''بھئی عورتوں کے لیے جنت تو نہیں ہے شاید دوزخ میں جگہ ہوگی۔ ہندو دھرم عورت کو بچوں اور شودروں کے ساتھ گنتا ہے۔گیتا میں یہی ہے اور قرآن میں بھی عورتوں پر پابندیاں ہیں۔مرد چار شادیاں کرسکتا ہے عورت کو مہر دے کر خرید سکتا ہے.....عیسائی مذہب تو عورت کو شیطان کی خالہ سمجھتا ہے۔ بس بی بی مریم کو چھوڑ کر-نہایت ناپاک رویہ ہے۔.....بس رنڈی ہی مزے میں ہے جب چاہیے جوتے مار کے گاہک کو دودھ کی مکھی کی طرح نکال کر پھینک دے.....''

بلکہ ان کے بعض خطوط فکری اور فلسفیانہ خیالات سے مملو ہیں:

''کئی بار خط لکھنے کا ارادہ کیا۔دن ہیں کہ ہوا کے گھوڑے پر سوار بھاگے چلے جاتے ہیں۔''

من جملہ طور پر یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ عصمت چغتائی کے خطوط میں نہ صرف ان کی شخصیت کے متنوع خاکے پوشیدہ ہیں بلکہ بایں ہمہ ان کے یہ خطوط اپنی ادبی خصائص اور فکری پہلوؤں سے بھی مالا مال ہیں۔ان خطوط کی اہمیت اور افادیت اپنی جگہ مسلم ہے۔ضرورت اس بات کی ہے کہ ان خطوط کی تحقیق اور بازیافت کرکے انھیں منصۂ شہود پر لایا جائے کیونکہ ان خطوط کے مطالعے سے مصنف کے بہت سارے تاریک گوشوں پر روشنی پڑتی ہے۔

□□□

Dr Mohd Younus Thokar
Assistant professor, (C)
Department of Urdu
Kashmir University
Hazratbal
Srinagar-190006 (J & K)
Mob: 9541690559
tahatalha101@gmail.com

محقق کے فرائض اور اوصاف

زرّین فاطمہ

محقق کے فرائض اور اوصاف سے پہلے ہمارے لیے جاننا ضروری ہے کہ تحقیق بذات خود کیا ہے۔ تحقیق عربی زبان کا لفظ ہے۔ جس کے معنی حق کی تلاش کے ہیں۔ یعنی کسی واقعے یا شے کی اصل حقیقت معلوم کرنا یا معلوم کرنے کی کوشش کرنا۔ اصطلاحی معنی میں تحقیق کے معنی نئے حقائق دریافت کرنا یا معلوماتی حقائق کی کوئی ایسی تفسیر پیش کرنا جس سے ہماری معلومات میں مزید اضافہ ہو جائے اور جو حتمی حقیقت ہے وہ کیا ہے اس کے لیے بار بار کوشش کرنا تحقیق کہلاتا ہے۔

وہٹنے تحقیق کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''تحقیق ایمانداری، جامعیت اور ذہانت کے ساتھ کی جانے والی کھوج ہے جو حقائق کے لیے، اور کسی پیش نظر مسئلے کے حوالے سے، ان حقائق کے مفاہیم و معانی یا اثر انداز ہونے والے نتائج کے لیے کی جاتی ہے۔ کسی تحقیقی کام کے نتائج کو اس مطالعاتی میدان میں مستند، قابل توثیق اضافہ ہونا چاہیے۔''

(تحقیق فکری وفنی مباحث مسائل، ڈاکٹر سید جاوید اقبال، مشمولہ مضمون، ص،99)

ڈاکٹر تلک سنگھ لکھتے ہیں:

''تحقیق علم کا وہ شعبہ ہے جس میں منظم لائحہ عمل کے تحت سائنسی اسلوب میں نامعلوم و نا موجود حقائق کی نئی تشریح اس طرح کرتے ہیں کی علم کے علاقے کی توسیع ہوتی ہے۔''[2]

(تحقیق کا فن، گیان چند جین، 2009 ص6)

ڈاکٹر نجم الاسلام تحقیق کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''تحقیق ایک انداز فکر کے اثر سے پروان چڑھتی ہے۔ جو ہمیں چیز کی حقیقت و حکمت جاننے کی طرف مائل کرتا ہے اور بیانات یا امور کی اصلیت کی کھوج لگانے پر آمادہ کرتا ہے۔ یہی وہ علم کا منبع ہے یہی اس کی توسیع یا اضافے کا وسیلہ ہے۔''

(ڈاکٹر نجم الاسلام، تحقیق کے روایتی اسلوب اور تحقیق اصول وضع اصطلاحات، مرتب اعجاز راہی، ص741)

قاضی عبدالودود لکھتے ہیں:

''تحقیق کسی امر کو اس کی اصل شکل میں دیکھنے کی کوشش ہے۔'' (تحقیق کا فن، گیان چند جین، ص3)

ایک کامیاب محقق کے اندر مختلف خوبیوں کا ہونا ضروری ہے۔ محقق کے کچھ اوصاف اور فرائض ہوتے ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں۔

سب سے پہلے طالب علم کے لیے ضروری ہے کہ وہ ریسرچ میں داخل ہونے کے بعد نگراں کا انتخاب کرے۔ نگراں کا انتخاب اکثر شعبہ کی جانب سے کیا جاتا ہے۔ نگراں کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ اپنے اسکالر کی تحقیق کے ہر میدان میں بھرپور تعاون کرے۔

دوسری اہم بات یہ ہے محقق کے لیے ضروری ہے کہ جس صنف میں اسے دلچسپی ہے اس کے مطابق اپنے لیے موضوع کا انتخاب کرے کیونکہ طالب علم کو جس موضوع پر تحقیق کرنی ہے اس میں اس کی دلچسپی کا ہونا بہت ضروری ہے تبھی وہ تحقیق کا بھرپور حق ادا کر سکے گا اور ایک اچھا محقق ثابت ہوگا۔ بعض اوقات نگراں اپنے طالب علم کو اپنی پسند کا موضوع دے دیتے ہیں جس میں اس کی دلچسپی نہیں ہوتی اور وہ اچھا محقق ثابت نہیں ہو پاتا ہے۔

ایک امریکی پروفیسر نے اس سلسلے میں بڑی دلچسپ بات کہی ہے:

> ''تحقیق کے لیے موضوع بے شمار ہیں۔ ہمیں اپنی پسند اور دلچسپی کے مطابق کوئی موضوع چن لینا چاہیے۔ اب اگر ہم کوئی ایسا موضوع اختیار کر لیں جس سے ہمیں دلچسپی نہیں، تو یہ ہمارا اپنا قصور ہے۔ جس طرح ہم تحقیقی ادب میں کسی خاص ظاہری وجہ کے بغیر اپنا موضوع منتخب کر لیتے ہیں، اسی طرح ریسرچ میں بھی ہمیشہ ہم پر اس بات کا واضح ہونا ضروری ہے کہ ہم نے فلاں موضوع کا انتخاب کس بنا پر کیا انتخاب موضوع کے لیے یہی جواز کافی ہے کہ اس سے ہمیں غیر معمولی دلچسپی ہے۔ آپ کسی نوجوان سے کہہ سکتے ہیں کہ میاں؛ تم فلاں لڑکی سے محبت کرو اور اپنی اس تجویز کے بہت سے فائدے بھی اسے بتا سکتے ہیں۔ لیکن ضروری نہیں کہ وہ آپ کے اس مشورے سے مطمئن ہو کر اس لڑکی کو چاہنا شروع کر دے۔ کیونکہ انتخاب تو اپنے فطری میلان اور ذاتی تجربے کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ بہرحال اگر وہ آپ کے مشورے پر کاربند ہو کر اپنی ذاتی رغبت کے بغیر محض آپ کے بتائے ہوئے فائدوں کی خاطر اس لڑکی سے شادی کر لے۔ یعنی استاد کے مشورے سے ایسا موضوع چن لے جس سے قطعی دلچسپی نہیں یا بہت کم دلچسپی ہے۔ تو پھر دوران تحقیق میں اسے جتنی زحمتیں اور تکلیفیں بھی برداشت کرنی پڑیں وہ ان سب کا مستحق اور سزاوار ہے۔''

(مضمون، تحقیق اور اس کا طریق کار، ڈاکٹر عندلیب شادانی، اردو میں اصول تحقیق، مرتب ڈاکٹر سلطانہ بخش، 2012، ص412)

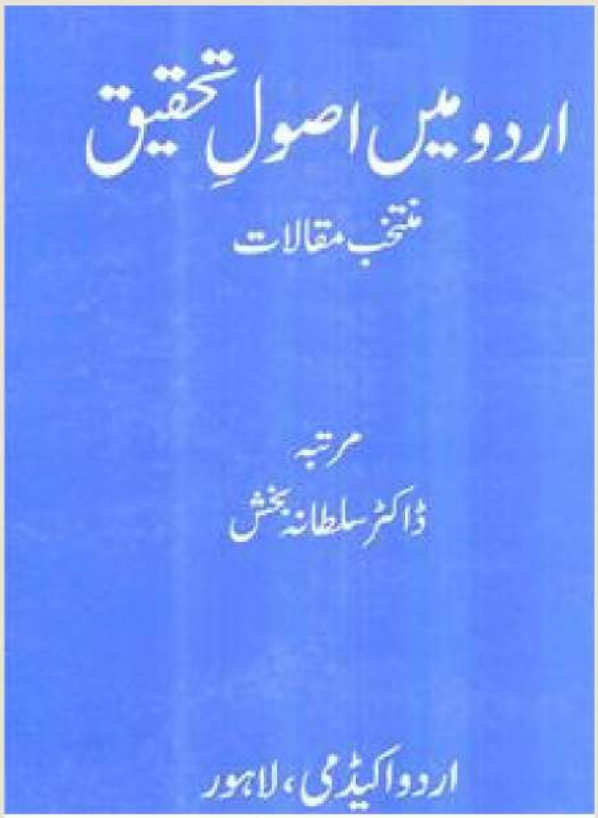

موضوع کا انتخاب کر لینے کے بعد محقق کے لیے ضروری ہے کہ جو موضوع اس نے چنا ہے اس پر اب تک جتنا کام ہوا ہے اس کا جائزہ لے اور اس موضوع سے متعلق جہاں سے بھی مواد مل سکتا ہے کہ اس کو حاصل کرے۔ اس کام کے لیے اس کو مختلف یونیورسٹیوں کی لائبریریاں، سیمینار کتب خانے، رسالے، ماہ نامے، جریدے، مخطوطات وغیرہ کا بھی جائزہ لینا چاہیے البتہ جہاں سے بھی مواد مل سکتا ہے وہاں سے بھرپور استفادہ کرے۔

بقول عبدالستار ردلوی:

> ''مواد کی فراہمی میں محقق کو ایک جاسوس کے فرائض انجام دینے پڑتے ہیں۔ اور اس کو مکھیوں کے زریعے شہد کی فراہمی جیسی محنت و مشقت سے کام لینا پڑتا ہے۔''

(مضمون، تحقیقی مواد کے اصول، ڈاکٹر سلمان علی، تحقیق فکری و فنی مباحث مسائل و امکانات، ص102)

اس کے بعد محقق کو اپنے موضوع سے متعلق خاکہ تیار کرنا چاہیے۔ جس طرح مکان بنانے کے لیے پہلے نقشہ تیار کیا جاتا ہے اسی طرح کسی موضوع پر تحقیق کرنے کے لیے پہلے خاکہ تیار کر لیتے ہیں۔ یہ مقالے کی تلخیص ہوتی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مقالہ نگار کس پہلو پر تحقیق کرنا چاہتا ہے۔

بقول ڈاکٹر عندلیب شادانی:

> ''خاکہ بنانے کے بعد ذہنی طور پر مقالے کی ایک ہیئت متعین

ہوجاتی ہے۔اس نقشے پر عمارت بنانا آسان ہے خاکہ میں جو عنوانات قائم کیے جائیں' ان میں ترتیب زمانی کا لحاظ مفید ہے بلکہ ضروری ہے۔''

(تحقیق کا طریق کار، ڈاکٹر عندلیب شادانی، اردو میں اصول تحقیق، ص 216)

خاکہ تیار کرنے کے بعد محقق مقالہ لکھنے کی تیاری کرے، اور جو مواد جمع کیا ہے اس کا مطالعہ کرے اور اس میں جو مفید معلومات ملیں ان کو لکھنا شروع کردے۔ محقق کو چاہیے کہ وہ اپنے مقالے میں ندرت پیدا کرے کیونکہ تحقیق کا مقصد ہی نیا پہلو تلاش کرنا ہے۔ تبھی ہماری تحقیق اچھی ثابت ہوسکتی ہے۔

محقق کو اپنے اندر حق گوئی کی صفت پیدا کرنی چاہیے۔ تحقیق حقیقت پر مبنی ہوتی ہے اس لیے اس کو ہر حال میں سچائی سے کام لینا چاہیے۔ بعض اوقات محقق کسی دوسری کتاب سے استفادہ کرنے کے بعد اس کا حوالہ نہیں دیتے ہیں جو ایک غیر محققانہ حرکت ہے دیگر کتابوں سے استفادہ کرنے کے بعد اس کتاب کا حوالہ دینا بہت ضروری ہے۔

محقق کو غیر جانب اور غیر متعصب ہونا چاہیے تحقیق کرتے وقت جو بھی حقیقت اس کے سامنے آئے محقق کو اس کا انکشاف کرنا چاہیے۔ اگرچہ وہ حقیقت اس کے گروہ، مذہب، جماعت یا اس کے استاد، شاگرد، یا اس کے عزیز کے ہی متعلق ہو، اسے ہر حال میں غیر جانب داری سے کام لینا ہوگا۔ اپنی پسند اور ناپسند کے ادیبوں مثلاً۔ میر، انیس، سرسید، اقبال، یا پریم چند وغیرہ میں دلچسپی ہو۔ لیکن تحقیق کے دوران ان کے خلاف کوئی بات معلوم ہوجائے تو اسے ہرگز نہ چھپائے بلکہ اس کو منظر عام پر لانے کی کوشش کرے۔

محقق جو مفروضہ تحقیق سے پہلے تیار کرتا ہے اور تحقیق کرتے وقت اس کے خلاف دلائل مل جائیں تو محقق کو اپنا مفروضہ تبدیل کرنے میں کوئی ضد نہیں کرنی چاہیے مثلاً۔ کوئی شعر فلاں شاعر کا ہے لیکن تحقیق کرتے وقت معلوم ہوا کہ مذکورہ بالا شعر کسی اور شاعر کا ہے۔ تو محقق کو اس بات کو تسلیم کرنے میں کوئی تامل نہیں ہونا چاہیے۔

تحقیق کا مقصد علم میں وسعت پیدا کرنا ہو۔ دنیاوی فائدہ یا کسی انعام کا لالچ تحقیق کا مقصد نہ ہو۔ جیسے کہ بہت سے لوگ اپنے نام کے ساتھ ڈاکٹر لفظ کا اضافہ کرنے کے لیے ریسرچ کرتے ہیں یا یہ کہ پی ایچ ڈی، کی ڈگری حاصل کرنے سے بے روزگاری کا مسئلہ حل ہوجائے گا یا ہم پروفیسر بن جائیں گے۔ تحقیق کا مقصد صرف اور صرف علم میں اضافہ کرنا ہونا چاہیے۔

تحقیق ایک محنت طلب کام ہے۔ محقق کو محنت سے کام کرنا چاہیے۔ یہ کام تب ہی ممکن ہوسکتا ہے جب کہ محقق کو اپنے موضوع سے دلچسپی اور لگن ہو۔

عبدالرزاق قریشی محقق کی محنت اور لگن کی مثال دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''کیونڈش کی محنت وانہماک کی یہ حالت تھی کہ اس کا دوپہر کا کھانا ایک سوراخ کے ذریعے سے اس کے کمرے میں رکھ دیا جاتا تھا۔ کہ اس کے کام میں خلل نہ پڑے۔''

(تحقیق کا فن، گیان چند جین، ص، 4)

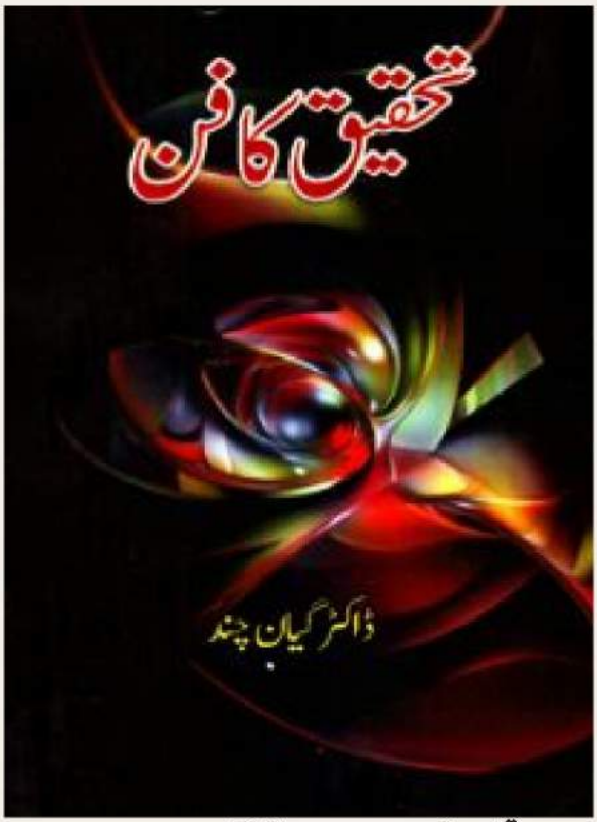

تحقیق مشکل کام ہے۔ اس لیے محقق کو صبر سے کام لینا چاہیے اور عجلت سے بچنا چاہیے۔ بعض اوقات جلد بازی کرنے سے تحقیق کا اصل معیار حاصل نہیں ہو پاتا ہے اس لیے محقق کو صبر اور تحمل سے کام لینا چاہیے۔

اس کے علاوہ محقق کو انصاف پسند ہونا چاہیے۔ اسے اعتدال سے کام لینا چاہیے اور مبالغہ سے پرہیز کرنا چاہیے۔ کیونکہ تحقیق میں مبالغے کی ذرّا برابر بھی گنجائش نہیں ہوتی ہے۔ یہ نہ ہو کہ محقق جس کو پسند کرے اسے آسمان پر بٹھادے اور جس کو ناپسند کرے اس کی بے شمار خوبیوں کے باوجود بھی اسے پست قرار دے۔ اور صرف اس کی کمزوریوں کو ہی نمایاں کرے۔

محقق کو اپنے علم پر غرور نہیں کرنا چاہیے۔اس کی طبیعت میں انکساری ہو۔اگر دوسرں کی تحریر سے مفید معلومات ملتی ہے تو اس سے استفادہ کرنے میں محقق کو کوئی تامل نہیں ہونا چاہیے بلکہ اس سے بھرپور فائدہ اٹھائے۔اس کے علاوہ کسی کے خوف کی وجہ سے حق بات کہنے سے نہ ڈرے بلکہ اخلاقی جرأت سے کام لے۔مثلاً اگر کوئی شخص بلند مرتبے کا حامل ہے اور اس کے بارے میں محقق حق بات کہنے سے اس لیے ڈر رہا ہے کہ اگر اس کے بارے میں حق بات لکھ دی تو تمام اہل فرقہ کا جم غفیر اس کے پیچھے پڑ جائے گا۔ہر محقق کو چاہیے کہ وہ کسی کی پیروی نہ کرے بلکہ وہ خود تحقیق کرے۔

اس سلسلے میں محسن الملک لکھتے ہیں:

> ''تحقیق کرنے والے کو ہر چیز کی تحقیقات کے لیے ضروری ہے کہ جو کچھ لوگوں سے سنا ہو یا جو کچھ اس نے خود سمجھ رکھا ہو۔اس سے اپنے دل و دماغ کو خالی کرلے اور کسی کی حقیقت اور صحت پر پہلے سے یقین نہ کرے اس لیے کہ اگر وہ ایسا کرے گا تو یا تحقیق کرنے پر اس کی توجہ نہ ہوگی اس لیے کہ وہ اپنے خیالات کو یقیناً سمجھ کر اپنے آپ کو مستغنی سمجھے گا یا تحقیقات کرتے وقت اس کو توہمات اور خطرات اسے پیدا ہوں گے۔کہ وہ اس تحقیق میں خلل ڈالیں گے۔''

(محسن الملک، تہذیب الاخلاق، جلد اول 1934، ص2، بحوالہ تحقیق کا فن، ص43)

محقق ضعیف الاعتقاد نہ ہو بلکہ وہ خرافات سے باہر نکل کر سوچنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔اس کے علاوہ تحقیق میں شک کو بنیادی اہمیت حاصل ہے ہر محقق کے اندر شک کا مادہ ہونا بہت ضروری ہے کیونکہ شک کی بنا پر ہی تحقیق کی جاتی ہے۔بغیر کسی دلیل کے وہ کسی بھی بات کو قبول نہ کرے بلکہ کسی بھی تحریر کو قبول کرنے سے پہلے اس کی جانچ پرکھ کرلے۔ محقق کا حافظہ اچھا ہونا چاہیے اور اس کے مزاج میں سائنس داں کی سی قطعیت ہو۔تحقیق کرتے وقت اگر اس موضوع سے متعلق کوئی بات پوشیدہ ہے تو محقق اس بات کو جاننے کی کوشش کرے۔یعنی کہ نامعلوم کو معلوم کرنے کا جذبہ اس کے اندر موجود ہو۔اردو زبان کے علاوہ دوسری زبانوں سے بھی واقفیت ہونا محقق کے لیے بہت ضروری ہے۔فارسی زبان کا اردو زبان سے بہت گہرا تعلق ہے۔اس کے علاوہ انگریزی اور عربی زبان سے بھی واقفیت ہونی بہت ضروری ہے۔

موجودہ موضوع پر اگر سابقہ لوگوں نے تحقیق کی ہے تو اس کا جائزہ لینا بھی محقق کے لیے ضروری ہے۔اس کے علاوہ محقق کو غیر ضروری ذمہ داریوں سے بھی اپنا دامن بچانا چاہیے۔ایسی بحثوں میں نہ الجھنا چاہیے جو اس کے موضوع سے متعلق نہ ہو یا جن کے بارے میں اس کا علم ناقص ہو۔یہ اسے قطعاً زیب نہیں دیتا۔

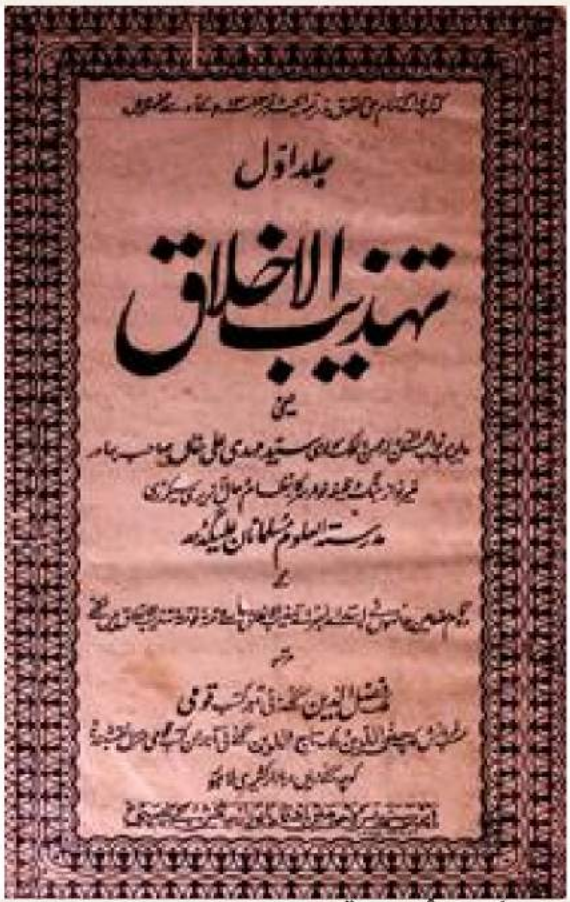

کسی بھی شخص میں تحقیق کرتے وقت مندرجہ بالا خوبیاں جس مقدار میں موجود ہوں گی وہ اتنا ہی کامیاب محقق ثابت ہوگا۔یہ تمام خوبیاں ایک پختہ کار محقق سے متعلق ہیں ان تمام خوبیوں کا ہونا ایک محقق کے اندر بہت ضروری ہے۔تبھی وہ ایک اچھا محقق ثابت ہو سکے گا اور تحقیق کا حق ادا کر پائے گا۔

□□□

Zarrin Fatima
Teemar Das Sarai
Near Junior High School
Urdu Ghar
Sambhal-244302 (U.P)
Mob: 9759817231

اعتراف ہنر

جبین نازاں

بارہ قباؤں کی سہیلی
عذرا پروین

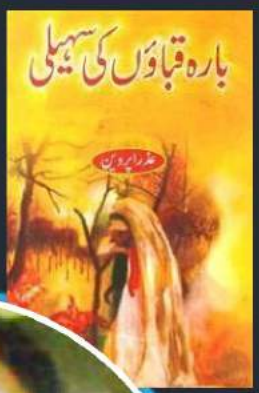

عذرا پروین نے 6 / دسمبر 1961 کو اپنے نانیہال اناؤ (یوپی) میں آنکھیں کھولی۔

عذرا پروین اکتسابی شاعرہ نہیں بلکہ میں انھیں پیدائشی شاعرہ کہوں تو اسے مبالغہ آمیزی نہ سمجھا جائے۔

عذرا پروین نے کم عمری سے لکھنا شروع کیا۔ پہلا افسانہ ''سن تپلی'' کے عنوان سے لکھا اور اس وقت کے معیاری رسالہ ماہنامہ ''روبی'' کے کہانی نمبر میں شائع ہوا، اور پہلا انعام کا مستحق قرار پایا۔ اپنی چھوٹی بہن (یہاں بتاتی چلوں کہ عذرا پروین چار بھائی بہنوں میں سب سے بڑی ہیں،) رعنا پروین کے اشتراک سے ایک ناول بھی تحریر کیا۔۔لیکن عذرا کی لاپروائی کے سبب ردی کے ساتھ فروخت ہوگیا۔۔۔

پھر شاعری کی طرف متوجہ ہوئیں، غزلیں کہتی رہیں، اور نظمیں لکھتی رہیں۔۔لیکن قارئین نے ان کی غزلوں پر نظموں کو فوقیت دی۔۔ پھر عذرا نظموں کے تئیں سنجیدہ ہوگئیں اور شعوری طور پر نظموں کی طرف متوجہ ہوئیں، قارئین افسانہ نگار عذرا کو بھول بیٹھے۔ غزل کی شاعرہ سے نظموں کی شاعرہ عذرا آگے نکل گئیں۔

ان کی نظمیں کہاں ہو شیام اور تم کافی پسند کی گئی۔

عذرا محبت سے لبریز معصوم میرا کی طرح اپنے شیام کی تلاش میں سرگرداں نظر آتی ہیں۔ شاید شیام مدھوبن میں گوپیوں کے جھنڈ میں گھرا بیٹھا ہے۔

تم کہاں ہو شیام
آخر کتنا رقص کروں میں
اور اب کتنا روپ بھروں
کتنا چاند کی چاندنی پی لوں
کتنا پتوں پھولوں کے رس سے
کتنا موسم کی نس نس سے
رنگ پیا، شرنگار جیا ہے
پھر بھی چھپا
مِرا شیام پیا ہے
میں وہ ابھا گی، وہ میرا ہوں
جس سے اس کا شیام کھو گیا ہے

اب تو پھر آؤ!
اپنی کانتی سے اپنی جیوت سے
اپنی روح سے میری مان بڑھادو
مجھ میں اتنا رقص کرو کہ
وجد کے سارے رنگ جگادو
دیے کی لو تم اتنی بڑھادی
دیے سبھی سورج بن جائیں منظر اچرج بن جائیں
شیام پیا، میرے شیام پیا

نظموں کی عذرا محبت سے لبریز پھول، شبنم ستارہ ہے تو غزل کی عذرا بپھری ہوئی لہر لہر آگ، اور انگارہ ہے۔

پھول شبنم اور ستارہ سے آگ اور انگارہ بننے کا سفر اپنے آپ میں انتہائی خوفناک ہے۔ کم عمری کے خواب جب تعبیر کی شکل میں زندگی کی حقیقتوں سے متصادم ہوتے ہیں۔

تب ردعمل کے طور پہ بغاوت کا جذبہ ابھرتا ہے، اور بحیثیت انسان اگر عملی طور پہ گھر، معاشرے، کی جانب سے طے کردہ اصول واقدار سے انحراف کرنے میں ناکام ہوتا ہے، تب اس شخص کے فکر وخیال میں حد درجہ بغاوت، اور انحرافی کیفیت جنم لیتی ہے، حتی کہ مثبت باتیں، درست اقدام کو بھی اپنے تئیں منفی نظر اور سازشی حربہ تصور کرنے لگتا ہے، اور یہ مقام ماہر نفسیات کی زباں میں ''ذہنی پیچیدگیاں'' کی ابتدا کہلاتی ہے۔ اور ادبی زبان میں جذبات واحساسات کا ادراک

بہر حال! بغاوت اور انحرافی فکر وخیال کی انتہا ملاحظہ فرمائیں!

میں بد گمانی حوا سے خلق کردہ ہو
میرے خمیر میں شک آگہی کی ابجد ہے

ڈوب جاؤں تو ڈبوتا نہیں پورا پورا
مجھ سے کرتا نہیں سودا کوئی پورا پورا

عجب ہوں تم میں لگا کر خود اپنے قد کا جوڑ

تلاش کرتی ہوں یہ تم ہو یا مرا قد ہے
تو میرے چین کی چابھی چھپا گیا کس میں
ہوا میں ڈھونڈوں اسے میں فلک میں بادل میں
میں گھٹن بھرا پنجرہ ہوں گو محبت ہوں

یگوں سے میں نے خود اپنا جہاں نہیں دیکھا

کہتے ہیں ادب اپنے عہد کا آئینہ ہوتا ہے۔ عذرا کی شاعری بھی اس آئینے میں معاشرے کا عکس اتار کر زمانے کو دکھا رہی ہے۔ لو دیکھو! یہ ترقی یافتہ دنیا ترقی پذیر ملک کے روشن خیال معاشرے کے ایک مہذب اور دینی گھرانے کی تصویر ۔۔

ایک خاتون کے شعری سرمائے کو نسائی خانے میں ڈالنے کی دانستہ اور سوچی سمجھی شرارت سے تعبیر کرتی ہوں میں۔ یہ نسائی لب ولہجہ نہیں بلکہ مرد اساس معاشرے کے ظلم وستم کا اظہار و بیان ہے۔ یہ طویل سلسلہ ہے، مجھے حیرت ہوتی ہے جب منٹو ''ٹھنڈا گوشت'' اور لاسینس لکھتا ہے، تو معاشرے کا ناسور کہا جاتا ہے اور اس کہانی کار کو مریض معاشرے کا معالج قرار دیا جاتا ہے۔ اور جب عصمت چغتائی لحاف، واجدہ تبسم نتھ اتارن، نتھ کا بوجھ لکھ رہی ہوتی ہے۔ ادب دنیا انھیں باغی ادیبہ قرار دیتا ہے۔

ادب کو صنفی خانوں میں تقسیم کرنے کی روش نے ادیبہ اور شاعرات کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ اس گلوبل عہد میں بھی نہیں۔

بہر حال! عذرا پروین فطرت مناظر کی شیدائی ہیں ۔ وہ بادل، پھول، تتلی، سمندر، پہاڑ، جھرنوں سے مکالمہ کرتی ہیں ۔ اور یہ مناظر بھی ان سے ہم کلام ہوتے ہیں ۔ یہ گفتگو ''خاموشیوں کی صدا'' کہلاتی ہے۔ ایک مقام پہ یہ صدا ''تنہائی کا شو'' بن جاتی ہے۔ اسے سننے کی تاب ہر انسان گوارا نہیں کرتا ۔۔ اور جو گوارا کرتا ہے ۔ وہ فنکار کہلاتا ہے جو اسے کبھی شاعری میں ، کبھی تصاویر، کبھی موسیقی میں جذب کر لیتا ہے۔ اور ہمارے سامنے پیش کرتا ہے۔ عذرا ان میں سے ہی ایک فنکارہ ہیں۔ ہمارے سامنے ان کی یہ نیازمندی کاغذ پہ لفظوں کے جال بننے لگتی ہے۔ یہ قصہ ان کی دو بہترین دوست بیٹیاں سناتی ہیں ۔ جدھر ہاتھ ڈالیے کاغذ کے پرزے مل جائیں گے۔ کسی ٹکڑے پہ ایک آدھ مصرع کسی میں صرف ایک دو الفاظ، کسی میں آدھ کسی میں ایک شعر، کسی میں فقط چند حروف کبھی یہ آپ کو شکر کے ڈبے میں تو کبھی گیس چولھے کے نیچے مڑا تڑا سا ملے گا۔

عذرا کو خود سے شکایت ہے، وہ دنیا سے بیزار نظر آتی ہیں باوجود اس کے عشق کے رنگ میں پور پور ڈوبی ہوئی بھی ہیں

۔ وہ عشق کا ایسا الاؤ ہیں جس میں خود بھسم نہیں ہوتیں۔ بلکہ اپنے ساتھ قاری کو بھسم کر ڈالتی ہیں۔

وہ کسی سے کوئی سمجھوتا کرنا نہیں چاہتیں، خود سے بھی نہیں، تصوف پسند عذرا ہمہ تن مراقب ہو کر اپنے عملی تجربے کو فنی شعور عطا کرتی ہیں۔ اپنے عشق میں سچی عذرا محبوب سے یوں ہم کلام ہوتی ہیں۔

نہ تیرا عشق قائم نہ میرا حسن قائم
تیری نگاہ مٹی ، میرا تیاگ مٹی

میں زندگی تھی مجھے بھی شہید رہنے دیا
وحید تم تھے کیوں مجھے وحید رہنے دیا
تو بھی شاید مجھ جیسا ہے
میرے سچ دب گئے اسی قیاس تلے
اب اتنا مجھے تنکا تنکا کون چنے
میں آندھی کے بعد کا منظر ہوں

تم رنگوں کی بھوک سے مرنے والے ہو
میں رنگوں کے بوجھ سے مرتا منظر ہوں

غلط ہے میں نے گزارے کسی حضور میں دن
بتائے ہیں میں نے سورہ کہف میں دن

میں پھر تمھارے قدموں سے چل پڑی ہوں شاید
تم جاگتے ہو مجھ میں ، میں سو پڑی ہوں شاید

فنا ہیں آنکھیں یہ رخسار وحسن ولب دھوکا
لکھو گمان کے کھاتے میں سب کا سب دھوکا

عورت ومرد کے مابین صدہا سال کی نابرابری کی روایت کا اظہار شعوری کوشش نہیں، بلکہ فطری جذبہ ہے۔جس طرح پھول کے کھلتے ہی خوشبو کا بکھرنا طے ہے۔ ویسے ہی دھوپ کی تمازت میں پھولوں کا مرجھانا بھی تسلیم شدہ حقیقت ہے۔اس حقیقت سے انحراف کذب بیانی کے سوا کچھ نہیں۔ ہر ظلم وستم سہہ کر محبوب کی آزمائش پہ کھرا اترنے کے لیے کبھی سیتا بن کر ''اگنی پریکھشا'' سے گزرنا ہوتا ہے، کبھی میرا بن کر ''وش'' پینا پڑتا ہے، کبھی ایک ہزار رات تک کہانی سنانا پڑتی ہے۔کبھی کچا گھڑا لے کر چناب میں کودنا ہوتا ہے۔کبھی آمر پالی کی طرح آگ کے گھنگھرو پہن کر ساری رات سوئی کی نوک پہ رقص کرنا پڑتا ہے پھر بھی عورت بے اعتبار اور کمزور ترین مخلوق تصور کی جاتی ہے۔

وہ میری راہوں میں آگ رکھ کر مجھے سفر سے ڈرا رہا ہے
اب آگ پہ ننگے پاؤں چل کر میں اس کو ڈرا رہی ہوں

جنگل تمھارا ٹھیک ہے بارش تمھاری
مجھ کو بھی اک شجر پہ سفارش تمھاری
تم نے چھینے تھے پھول بھی میرے
آگ کا رقص بھی تمہی دیکھو
سمٹ گئی تو شبنم پھول ستارہ تھی
بپھری تو لہر لہر انگارہ تھی
جب آگہی کا مرا سلسلہ بھٹکتا ہے
مرا بھی ہاتھ مرا دل بہت جھٹکتا ہے

جسے نسائی جذبات واحساسات کی شاعری کہا جاتا رہا ہے، ان جذبات واحساسات سے مرد شعرا مبرا رہے ہیں؟

محبت جہاں شبنم پھول ستارہ بنا ڈالتی ہے، وہیں بے اعتنائی بے توجہی شعلہ، پتھر، خار، انگارہ، اور نہ جانے کیا کیا بنا کر رکھ دیتی ہے۔ عہد قدیم سے عہد جدید تک لڑی جانے والی جنگیں کیا ہیں؟ ہر کس وناکس بخوبی واقف ہے ان تمام جنگوں کا نصف حصہ کی بھی ذمے دار عورت نہیں رہی، تو پھر مرد خود کو تعمیر پسند اور عورت کو تخریب کار کیسے کہہ سکتا ہے؟؟

ہر شاعر نے کسی خاص لفظ کو اہمیت دی ہے مثلاً کسی نے اسیری، قفس، زنداں، صیاد کو تو کسی نے درد دل، دل ناداں، ابن مریم، شمع، پروانہ، کسی نے شاہین، خودی، گنبد، بحر، کرگس، کسی نے صنم، چمن، صحرا جام و مینا، رقص وسرور وغیرہ الفاظ برتے رہیں۔ پروین شاکر نے لفظ خوشبو اس قدر استعمال کیا کہ اردو ادب میں "خوشبو" کے نام سے مشہور ہوئیں۔ ویسے ہی عذرا نے ہوا پانی اور مٹی، کو بطور خاص استعمال کرتی رہی ہیں۔ کبھی استعارے کے طور پہ تو کبھی علامت وتشبیہات کے طور پہ بکثرت مل جائیں گے۔ انسان کا آغاز مٹی ہے اور انجام بھی مٹی لہٰذا مٹی سے مٹی ہونے تک کے سفر کے تمام اسرار رموز کو مٹی کے پیرائے میں بیان کرنا ان کی حکمت عملی رہی ہو کہ زندگی کی حقیقت بس اتنی سی ہے۔

یہی وجہ کہ انھوں نے پہلے شعری مجموعہ کا نام بھی ''راگ راگ مٹی'' رکھا۔

مٹی ہوں میں میرا پانی کل میری آگ مٹی
میں سب سروں میں مٹی میں راگ راگ مٹی

خود اپنی مٹی میں بیدار آگ بھی آندھی
مجھے خمار گل سے پلید رہنے دیا
کھویا جو تیری خاطر سب کچھ تو کچھ نہ کھویا
اپنی بساط کیا تھی مٹی کا تیاگ مٹی

عذرا کی شاعری کا ایک وصف بہت نمایاں ہے کہ انھوں نے اپنی شاعری میں دسمبر (ماہ دسمبر کو آج کے تقریباً تمام شعرا و شاعرات استعمال کرتے رہے ہیں) کے علاوہ دیگر انگریزی مہینوں کو شاید پہلی بار بطور استعارہ اور علامت کثرت سے استعمال کیا ہے۔ ہندی کے بارہ مہینوں پہ مشتمل بارہ ماسہ بہت مشہور ہے۔ جسے کئی شعرا نے لکھا ہے۔ اردو میں صلاح الدین پرویز بھی بارہ ماسہ لکھ چکے ہیں۔

بہر حال! عذرا پروین کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

کبھی اسپرش میں جولائی تھا وہ
کبھی خوشبوؤں میں فروری تھا

بس عنقریب دسمبر مری قبا ہوگا
سب انہماک ہے سورج کے بس نومبر تک

یہ کس نے ڈھانپ دیا مجھ کو سرد پھولوں سے
یہ رس برستا ہے یا فروری کی آمد ہے
اب بھی اپریل کے آتے ہی
میرے چاروں طرف
ایک روتی ہوئی عورت کی صدا تیرتی ہے

دوسرے شعری مجموعہ کا نام ''بارہ قباؤں کی سہیلی'' ہے۔ اس مجموعہ میں ایک نظم اس عنوان سے شامل ہے۔ ''بارہ قباؤں کی سہیلی'' طویل نظم ہے۔ بارہ قبائیں دراصل بارہ مہینے ہیں۔

ان بارہ مہینوں کی سہیلی کوئی اور نہیں عذرا پروین ہیں اور یہ عذرا عالمی گاؤں کی وہ عورت ہے جو خود کو آج بھی پدرانہ نظام کے پھیلائے ہوئے جال میں پھنسی ہوئی جکڑی ہوئی گھٹن محسوس کر رہی ہے، کھلی فضا بھی اس قدر پراگندہ ہو چکی کہ صاف و شفاف ہوا ناپید ہے۔ اگرچہ جال وہی پرانا ہے البتہ نام نیا دیا گیا ہے، جسے ہم معاشی سیاسی سماجی مساوات کہتے نہیں تھکتے۔ لیکن اس مساوات کے پس پردہ مقاصد وہی رہے استحصال جبر و تشدد۔۔ عالمی گاؤں کی عورت کی حالت زار پچھلی صدی کی عورت سے ذرا بھی مختلف نہیں بلکہ پچھلی صدیوں کی بہ نسبت حیوانیت درندگی مزید اندوہناک انداز میں روا ہے۔

ان کی نظم ''خسارہ'' ملاحظہ فرمائیں!

''تم تو صرف کتے ہی نکلے
میں تو اس میں مرد ڈھونڈتی تھی
میں اس مرد میں باپ بھی چاہتی تھی
میں تو اس باپ میں ایک بچہ بھی
میں اس بچے میں خدا بھی
مگر تم
تم تو.....صرف کتے نکلے
اور میں ماں نکلی''

بارہ قباؤں کی سہیلی کے اندر یہ بغاوت مرد اساس معاشرے کے رویے کے خلاف انحراف و بغاوت نہیں بلکہ صدیوں صدی سے رائج عمل کا ردعمل ہے جو ہر اس کا شخص کا علامیہ ہے۔ جو ذی فہم ذی شعور ہوتا ہے۔ اور پھر اس کے وجدان کی آنکھیں وا ہو جاتی ہیں۔ وہ اپنی طاقت اور صلاحیت کے بل پہ مدمقابل سے زور آزما ہوتا ہے۔ عذرا اپنی شعری طاقت کے توسط سے دست و گریباں ہیں۔ سماجی رویے کے خلاف اس قدر غم و غصہ اور شدید احتجاج ہمیں بہت کچھ سوچنے پہ مجبور کرتا ہے۔

عذرا پروین کا یہی وصف انھیں مزاحمتی اور انحرافی نسائی شاعری کی فہرست میں منفرد مقام عطا کرتا ہے۔ ان کی اس خوبی پر کہ ان کی شاعری پڑھتے ہوئے آپ یہ حتمی فیصلہ نہیں کر سکتے، کہ یہ خوش ہیں یا اداس۔۔۔

عذرا پروین کی شاعری کو اگر بھلا بھی دیا گیا تو ان کا یہ شعر کافی مشہور ہو چکا ہے اور ضرب الامثال اشعار کی فہرست میں جگہ بنا چکا ہے۔ میں پر امید ہوں کہ انھیں زندہ رکھے گا

سچ کو حاجت سے بچا کر رکھنا
سچ اکیلا ہے خریدار بہت

عذرا پروین ابھی فعال ہیں اور متحرک بھی کیوں کہ ان کے فن کا رقص ابھی ادھورا ہے۔

آگ سے کہنا اور جلے یہ ہوا دیوانی اور چلے
دل کا ہر گھنگھرو جھنکاؤ، میرا رقص ادھورا ہے

□□□

Jabeen Nazan
2nd Floor
J23-Gali No 12
Near Abdullah Masjid
Ramesh Park,
Laxmi Nagar
New Delhi-110092

آن لائن تعلیم حال اور مستقبل

ڈاکٹر تسنیم بانو

تغیرات عہد میں جہاں سب کچھ برقی (Digital) ہو رہا ہے وہیں تعلیمی نظام بھی اس سے چھوٹا نہیں ہے کووڈ19 جیسی وبا نے حیات انسانی کے تقریباً سبھی شعبات پر گہرا اثر ڈالا ہے جس میں تعلیمی نظام پر سب سے زیادہ اثرات مرتب ہوئے ہیں۔ وقت کی مانگ کے مطابق آن لائن تعلیم کو ترقی مل رہی ہے۔ ہندوستانی حکومت نے کووڈ۔19 کی وبا کے دور میں بچوں کے تعلیم کا انتظام کرنے کے لیے ''بھارت پڑھے آن لائن یوجنا'' کا آغاز کیا ہے۔ اس یوجنا کا آغاز ہندوستان کے وزیر تعلیم نے 2020 میں کیا تھا۔ آن لائن تعلیم کی بڑھتی اہمیت کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ حالانکہ مستقبل میں بھی آن لائن تعلیم کی اہمیت روز بروز بڑھتی جائے گی۔ لیکن سبھی کو یہ خیال رکھنا ہوگا کہ آن لائن تعلیم کے فائدے کے ساتھ ساتھ بعض عملی نقصانات بھی ہیں۔ جس کی وجہ سے آن لائن تعلیمی نظام کو محتاط ہو کر اس کو اختیار کرنے ضرورت ہے۔

آن لائن تعلیم کے معنی: آن لائن تعلیم کمپیوٹر اور نیٹ ورک سے متعلق ہے۔ جس میں طلبہ گھر پر رہ کر ہی تعلیم حاصل کرتے ہیں ساتھ ہی طلبہ کو آن لائن و آف لائن ویڈیو کے ذریع بھی فائدہ پہنچتا ہے۔ اس میں استاد کا طلبہ سے سیدھے رابطہ نہیں ہوتا بلکہ برقی اسکرین کے ذریعے رابطہ ہوتا ہے۔ آن لائن تعلیم دینے کے لیے انٹرنیٹ کنکشن، کمپیوٹر، اسمارٹ موبائل، ٹیبلیٹ، لیپ ٹاپ وغیرہ جیسی اہم اشیاء کی ضرورت ہوتی ہے۔ آن لائن تعلیم کے مندرجہ ذیل اقسام یا ذرائع ہیں۔

لایو ویڈیو کلاسز (Live Video Classes):

اس کے تحت ایک ہی وقت میں طالبات وطلبہ اور اساتذہ مختلف جگہوں سے ایک دوسرے سے تعلیمی مکالمہ کرتے ہیں۔ اس طرح کی کلاس میں طلبہ اپنے سوالوں کا فوراً جواب حاصل کر پاتے ہیں۔ اس میں طالبہ کے مضمون سے متعلق دشواری و پریشانی دور ہو جاتی ہے۔ اسی وجہ سے اس کو ''ریئل ٹائم لرننگ'' (Real Time Lerning) بھی کہا جاتا ہے۔

پری ریکارڈیڈ ویڈیو کلاسز (Pre Recorded Vidio Classes):

اس میں نصاب سے متعلق جانکاری یا اطلاع کو پہلے سے ویڈیو کے طور پر ریکارڈ کر کے رکھا جاتا ہے۔ اس طرح کی آن لائن تعلیم کا فائدہ یہ ہے کہ طلبہ کسی بھی وقت اس کا فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ اس کلاس کو کبھی بھی دیکھ سکتے ہیں۔ اس تعلیمی نظام میں طلبہ اور مدرس کے درمیان اصل وقت میں تعلیمی مکالمہ کا کوئی متبادل موجود نہیں ہوتا ہے۔ اس میں طلبہ اپنے سوالات کو کمنٹ باکس (Comment Box) میں پوچھتے ہیں جس کا جواب کمنٹ باکس یا پھر اگلی کلاس میں دیا جاتا ہے۔

سلائیڈ (Slide):

سلائیڈ آن لائن تعلیم میں چھوٹی سے چھوٹی اشیا کا مطالعہ میں سلائیڈ نظام بیحد کارآمد ہے ان کا استعمال تدریسی مہارت کو اثر دار بناتا ہے۔سلائیڈ کو دکھانے کے لیے پروجیکٹر (Projecter) کی ضرورت ہوتی ہے۔سلائیڈ کی کئی قسمیں ہیں: لیٹرن سلائیڈ (Lantern Slide)، سیل فون سلائیڈ (Cellphone Slide)، گلاس سلائیڈ (Glass Slide)، فوٹوگرافک سلائیڈ (Photographic Slide) وغیرہ۔

آن لائن ٹیسٹ (Online Test):

آج ڈیجیٹل عہد میں آن لائن ٹیسٹ کی اہمیت بڑھ گئی ہے۔اس کی مدد سے طلبہ کو امتحان کی تیاری میں کافی مدد ملتی ہے۔کیونکہ اس سے طلبہ اپنی غلطیوں کو صحیح کر سکتے ہیں۔ساتھ ہی اپنے مقررہ وقت کو بھی طے کر سکتے ہیں۔یہ ٹیسٹ کاغذ قلم سے نہیں، بلکہ کمپیوٹر پر کیا جاتا ہے۔امتحان شروع ہونے سے 15 منٹ پہلے اسٹارٹ ٹیوٹوریل (Start Tutorial) سے امتحان کے اصول بتائے جاتے ہیں پھر امتحان شروع ہوتا ہے۔کمپیوٹر کی بورڈ (Keybord) اور ماؤس (Maus) کے ذریعے سوالات کے جوابات دیئے جاتے ہیں۔آج کل بچے گھر بیٹھ کر بھی اپنے اسمارٹ فون سے آن لائن ٹیسٹ دے سکتے ہیں۔

پی۔ڈی۔ایف (PDF):

پی ڈی ایف کے ذریعے آن لائن تعلیم پری ریکارڈیڈ ویڈیو کلاسیز (Pre Recorded Video) یا سلائیڈ (Slide) کے ذریعے تعلیم دی جاتی ہے جس میں لیکچر کے دوران پی ڈی ایف کے ایک ایک صفحہ کو اسکرین پر دکھا کر پڑھایا جاتا ہے۔اس میں سب سے پہلے نصاب کو پی ڈی ایف میں کنورٹ (Convert) کر دیا جاتا ہے اس کے بعد لائیو کلاسیز یا پہلے سے ویڈیو بنا کر ویب سائڈ پر اپ لوڈ کر دی جاتی ہیں وہ اسی پر چلتی رہتی ہیں۔اس ویڈیو کے نیچے ہی پی ڈی ایف ڈاؤن لوڈ کرنے کا لنک بھی دیا جاتا ہے۔

آن لائن تعلیم کے فائدے: آن لائن تعلیم کے مندرجہ ذیل فوائد ہیں۔

☆ آن لائن تعلیم کے ذریعے سے جماعت میں درس و تدریس کو دلچسپ اور گفتگو والا بنایا جا رہا ہے، جس پر طلبہ اس سے زیادہ سے زیادہ توجہ دیں۔

☆ آن لائن تعلیم کوئی بھی، کہیں بھی حاصل کر سکتا ہے۔مثال کے طور پر سفر کے دوران یا پھر کسی وجہ سے چھٹی لینے پر چھوٹے ہوئے مضمون (subject) سے متعلق معلومات حاصل کر سکتے ہیں۔

☆ آن لائن تعلیم سے طلبہ نئے نئے ترغیب و طریقے سے علم حاصل کریں گے۔ساتھ ہی مدرس پر قابل اور تازہ ترین علم سے غافل ہونے کے جو الزامات عائد ہوتے ہیں، انھیں بھی دور کیا جا سکتا ہے۔

☆ ہندوستان جیسے وسعت یافتہ ممالک میں اسکول یا کالج زیادہ نہیں ہیں۔آن لائن تعلیم سے اسکول اور کالجوں پر بھی زور کم ہوگا۔نیز والدین اور بچوں کے لیے اپنے ڈھنگ سے پڑھنے پڑھانے کی آزادی ہوگی یعنی اسکول کالجوں میں داخلے کی ضرورت ختم ہو جائے گی۔

☆ آن لائن تعلیم ماحول کی نظر سے بھی فائدے مند ہے، کیونکہ آن لائن پر سے انحصار کتاب، کاپی، پینسل اور قلم کی ضرورت کم رہے گی۔

☆ آن لائن تعلیم سے طلبہ ذاتی طور پر یہ سمجھیں گے کہ وہ کیسے سیکھتے ہیں، انھیں کیا پسند ہے اور کس طرح کی حمایت کی ضرورت ہے۔ ساتھ ہی اسٹوڈینٹ آزاد ہو کر تحقیق کریں گے اور ایک نئی راہ ہموار کریں گے۔

☆ آن لائن تعلیم کے طریقے سے وقت کی بچت ہوتی ہے ساتھ ہی مختلف قسم سے علم بھی حاصل کرتے ہیں۔

☆ تیزی اور گہرا مطالعہ کے لیے آن لائن شعبہ بیحد اثر انگیز ہے۔ اس میں معلومات کا مجموعہ نہ صرف تیزی سے ہوتا ہے بلکہ تخلیقی تنوع کے نقطہ نظر سے بھی اس کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔

☆ آن لائن تعلیم سے طلبہ وطالبات کو کائنات کے بہترین اساتذہ سے معیاری تعلیم حاصل کرنے کا موقع مل سکتا ہے۔

آن لائن تعلیم کے نقصانات: آن لائن تعلیم کے مندرجہ ذیل نقصانات ہیں:۔

☆ آن لائن تعلیم کمپیوٹر پر منحصر نیٹ ورک سے متعلق ہے، جس کے لیے آلات کی ضرورت ہوتی ہے جو بہت مہنگے ہوتے ہیں اس وجہ سے آن لائن تعلیم حاصل کرنا سب کے لیے ممکن نہیں ہے۔

☆ آن لائن تعلیم کے ذریعے طلبہ کسی سوال کا جواب انٹرنیٹ پر آسانی سے حاصل کر لیتا ہے ایسے میں طلبہ کبھی کسی مضمون (Subject) پر پڑھتے ہوئے زیادہ غور وفکر نہیں کرتے، جس سے بچوں میں تخلیقی صلاحیت میں کمی آتی ہے۔

☆ آن لائن تعلیم یا ڈیجیٹل تعلیم چاہے کتنی بھی سہولت طلبہ کو مہیّا کرادیں جائیں لیکن اس سہولیت کی وجہ سے طلبہ میں خراب مطالعہ کی عادت پڑ رہی ہے اور طلبہ میں سست نقطہ نظر کو بڑھاوا مل رہا ہے۔

☆ آن لائن تعلیم کے لیے برق کی بہت زیادہ بجلی کی فراہمی اور ہر جگہ انٹرنیٹ کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن ہندوستان میں ابھی اس کی بہت کمی ہے۔

☆ آن لائن تعلیم سے مطالعہ کے لیے گھر کا ماحول مثبت نہیں ہوگا، کیونکہ طلبہ اپنے گھر پر آن لائن کھیل اور سوشل میڈیا کا استعمال کر سکتے ہیں جبکہ مدرسہ، اسکول اور کالج میں تعلیم کا مناسب ماحول ہوتا ہے۔

☆ آن لائن تعلیم سے طلبہ کے دیکھنے کی صلاحیت پر اثر پڑ سکتا ہے کیونکہ اگر طلبہ مطالعہ کا فعال حصہ نہ بن پایا تو اس کا الہام ختم ہو جاتا ہے۔

☆ بقول ماہر نفسیات آن لائن تعلیم کشیدگی سے لبریز ہوتی ہے ان کی تحقیق کے مطابق ۱۵ منٹ آن لائن مطالعہ کرنے کے بعد طلبہ کو لکھنے کی دلچسپی ختم ہو جاتی ہے اور وہ تفریح وطبع کی سائڈس پر پہنچ جاتے ہیں۔

☆ حال کے نئے سروے کے مطابق آن لائن تعلیم سے بچوں کے جسمانی اور ذہنی صحت پر برے اثرات نظر آتے ہیں۔

☆ ہندوستانی مفکرین کی روایت کے مطابق تعلیم کے تین مقصد ہیں: شخصیت، کردار کی تعمیر اور سماجی بہبود کی مسلسل ترقی۔ آن لائن تعلیم ان مقاصد کی تکمیل کہاں تک کرتی ہے، اس کی جانچ بیحد ضروری ہے۔

☆ متعدد مضامین بہت ہی عملی ہیں: جیسے سائنس کے تجربات، دستکاری، جسمانی تعلیم اور ڈیزائن وغیرہ میں طلبہ کا ہاتھ پکڑ کر سیکھانا زیادہ بہتر اور اثر دار ہوتا ہے۔

☆ زیادہ تر طلبہ آن لائن تعلیم کے لیے تربیت یافتہ نہیں ہیں جس وجہ سے آن لائن تعلیم کا سامنا کرنے سے طلبہ دور بھاگتے ہیں۔

آن لائن تعلیم کے فروغ کے لیے کوششیں:

تغیرات دستور زمانہ ہے۔ تبدیلی کے اس عہد میں جو ملک، سماج اور شخص اپنے کو تبدیل کر لیں گے وہ یقیناً ترقی کے راستے پر گامزن ہوگا۔ موجودہ عہد ڈیجیٹل ہے۔ پھر کووڈ-19 وبا نے پوری دنیا کے نظام کو تبدیل کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج مختلف ممالک میں آن لائن تعلیم کی زیادہ سے زیادہ وکالت کی جا رہی ہے۔ حالانکہ اس شعبہ میں ترقی یافتہ ممالک نے بہت پہلے پہل کر لی تھی۔

ہندوستان میں اسکول، کالج اور یونیورسٹی وغیرہ کی ساخت میں آن لائن تعلیم کو اہمیت دی جا رہی ہے۔ یہاں تک کہ مختلف مقابلہ جاتی امتحانات میں جیسے: سول سیوا (Civil Services)، میڈیکل، انجینئرنگ وغیرہ کی تیاری کرانے والے کوچنگ سینٹر بھی اس میں لگ گئے ہیں۔ ہندوستانی حکومت نے اس سال کے بجٹ میں تقریباً سو کالجوں میں آن لائن تعلیم کے انتظامات کیے ہیں۔ ہندوستانی حکومت کے ذریعے آن لائن تعلیم کو فروغ دینے کے لیے کوششیں کی جا رہی ہیں۔ جس کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے:

1۔ سویم (SWAYAM): اس کی تفصیل Study Webs of Active-Learning for Young Aspiring Minds ہے۔ یہ ایک ایسا مفت آن لائن پورٹل ہے جو حال کے نوجوانوں کو سیکھنے کی صلاحیت کو انٹرنیٹ کے ذریعے مکمل کراتا ہے۔ اس کے آغاز سے مطالعہ کا مواد اور کلاس کے تجربات کے ویڈیو کو طلبہ و طالبات کو مفت مہیا کرایا جاتا ہے۔

2۔سویم پربھا (SWAYAM PRABHA) : یہ آن لائن تعلیم انسانی وسائل وزارت کے تحت سال 2017 میں شروع کی گئی تھی۔ 34 چینل والی سویم پربھا طلبہ وطالبات کے لیے مفت آن لائن تعلیم فراہم کرانے والا پورٹل (Portal) ہے۔اس پورٹل کے ذریعے سے اسکول سے لے کر کالج تک کے سبھی طلبہ وطالبات کی مدد کی جائے گی۔اس منصوبہ کا خاص مقصد معاشی طور سے کمزور طبقے کے طلبہ وطالبات اور سماج میں پست طبقے کے طلبہ وطالبات کو بہترین تعلیم فراہم کرائی جائے گی۔

3۔موکس (MOOCS) : موکس یعنی Massive Open Online course ہے۔ یہ آن لائن پورٹل یونیورسٹی سطح کا ہے۔جس میں تعلیمی نصاب تیار کرایا جاتا ہے جو عام لوگوں کے لیے کھولا گیا ہے۔اس کے تحت لوگوں کو اپنے لیے کسی مضمون (Subject) پر لوگوں سے عالمی پیمانے پر جڑنے کا موقع فراہم کرایا جائے گا۔اس میں کوئی جغرافیائی حد نہیں ہے۔

4۔ بھارت پڑھے آن لائن: کرونا وبا کے دور میں انسانی وسائل و ترقی وزارت نے ہندوستان کے آن لائن تعلیمی نظام کو بہتر بنانے کے لیے لوگوں کی سوچ ومشورہ لینے کے لیے مدعو کیا۔جس میں بھارت پڑھے آن لائن کے نام سے ہفتہ وار ایک مہم شروع کی گئی۔اس مہم کا مقصد آن لائن تعلیمی نظام میں کسی طرح کی رکاوٹ نہ آئے ۔کسی بھی طرح کی موجود رکاوٹ کو ختم کرنا۔اس کے لیے انسانی وسائل وترقی وزارت کے ساتھ سیدھا مشورہ اور حل دینے کے لیے ہندوستان کے بااثر لوگوں کو مدعو کیا جاتا ہے۔

5۔ویدیا دان 2.0 (Vidyadaan 2.0): یہ ایک قومی پروگرام ہے۔اس کورس کا آغاز انسانی وسائل وترقی وزارت نے ای۔تعلیم سے متعلق مضمون کے مواد کو یکجا کرنے کے لیے کیا ہے۔قومی پروگرام میں جس شخص (استاد، ماہر تعلیم، موضوع کے ماہر وغیرہ) اور ادارہ (اسکول، کالج، یونیورسٹی وغیرہ) تعلیم کے شعبہ میں ای۔تعلیم سے شراکت کر سکتے ہیں۔

ویدیا دان پروگرام کا آغاز باضابطہ طور پر کووڈ۔19 کے پس منظر میں طلبہ وطالبات (اسکول اور اعلیٰ تعلیم دونوں پر) کے لیے ای۔تعلیم میں مضمون کے مواد کی بڑھتی ہوئی ضرورت اور تدریس کی ترقی کے لیے اسکولی تعلیم کے ساتھ ساتھ ڈیجیٹل تعلیم کو ضم کرنے کی فوری ضرورت کو مکمل کرنے کے لیے کیا گیا ہے۔اس پروگرام کے تحت ملک بھر میں کسی بھی وقت اور کہیں سے بھی تعلیم کو جاری رکھنے کے لیے ایک دیکچھا (Diksha) ایپ بھی جاری کیا گیا ہے۔

6۔دیکچھا (DIKSHA): یہ Digital Intrastructure and Knowladge Sharing کو انسانی وسائل وترقی وزارت نے سال 2017 میں شروع کیا تھا اس کا مقصد تھا کہ طلبہ وطالبات کو تعلیمی مواد فراہم کرانا اور اساتذہ کی صلاحیت کو فروغ دینے کے لیے چلایا گیا ہے۔موجودہ دور میں دیکچھا میں اردو، ہندی، انگریزی، آسامی، بنگالی، گجراتی، کنڑا، مراٹھی، اڑیا، پنجابی، تمل اور تیلگو زبانوں میں مواد کی تخلیق اور پڑھنے کے لیے تعاون فراہم کرتا ہے۔

7۔پی ایم ای۔ودیا (PM Evidya): یہ بھی آن لائن تعلیم کا ایک ذریعہ ہے۔اسے کووڈ۔19 اور لاک ڈاؤن کی وجہ سے ہو رہے اکیڈمی کے نقصان کو دور کرنے کے لیے مرکزی حکومت نے چلایا تھا۔اس پروگرام کے تحت طلبہ وطالبات کو مختلف ذرائع کی طرف سے تعلیمی مواد دستیاب کرایا جائے گا۔ساتھ ہی جماعت ایک سے لے کر بارہویں تک کے لیے مختلف ٹی وی چینلوں کا آغاز بھی کیا گیا ہے۔

بلاشبہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ آن لائن تعلیم کے بارے میں کچھ چیلنجز (Challenges) موجود ہیں جس کو دور کیا جانا چاہیے، ساتھ ہی آن لائن تعلیم کے عہد حاضر کی صورتحال میں مفید بھی ہے۔ڈیجیٹل عہد اور کورونا کی دہشت نے آن لائن تعلیم کی اہمیت وافادیت کو بڑھا دیا ہے، جس کو حکومت کے مختلف تعلیمی پروگرام سے سمجھا جا سکتا ہے لیکن ساتھ ہی ہمیں آن لائن تعلیم کی کڑی نگرانی بھی کرنی چاہیے جس سے کہ طلبہ وطالبات کو اس تکنیک کا پورا فائدہ مل سکے۔حقیقت میں آج کے ماحول کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ آن لائن تعلیم کا مستقبل تابناک ہے۔

□□□

Dr. Tasleem Bano
Sadarpur
Sitapur-261201(U.P)
Mob: 9990254708

ڈاکٹر ریشا قمر

نظم

''تیرے جانے سے''

دسمبر سن!
ترے جانے سے/ دنیا شانت ہوتی ہے
اداسی دل کی مٹی ہے/ چبھن سینے سے جاتی ہے
نئی امید بندھتی ہے/ ملن کی آس اپنے پاس آتی ہے
نئے ارماں جگاتی ہے
گھنی تنہائیوں کی دھند میں/ شمعیں جلاتی ہے
اندھیروں کے منڈیروں کو/ دیپوں سے جگمگاتی ہے
ترے جانے سے ظلمت ختم ہوتی ہے

دسمبر سن!
مصیبت کے/ کدورت کے
عداوت کے/ حقارت کے
تعصب کے/ تعجب کے/ تعفن کے
گھنے بادل/ سبھی کو ساتھ لے جانا
فضا کا شر/ ہوا کا ڈر
بلا کا سر بھی لے جانا
چبھن/ سوزش/ جلن/ اینٹھن
تپش/ پیڑا/ گھٹن
جتنی بلائیں تن سے چمٹی ہیں
رگ و ریشے سے لپٹی ہیں
انھیں مٹی کے اندر دفن کر دینا

دسمبر سن!
کھڑا جو پاس تیرے سال ہے
اس سے ذرا کہنا:
محبت کے/ اخوت کے
مروت کے/ مسرت کے
اماں کے/ آشتی کے
پیار کے/ اخلاص کے
تحفے بھی کچھ لائے
ذرا ہمراہ اپنے
کچھ نئے رشتے بھی لے آئے/ کہ جن سے دوریوں کا درد مٹ جائے
کہ جن سے تلخیوں کا ابر چھٹ جائے
کہ جن سے پھول کھل جائے/ کہ جن سے رنگ مل جائے
کہ جن سے من مہک جائے/ کہ جن سے تن چہک جائے
کہ جن سے کیف کی برسات ہو جائے

Dr.Ramisha Qamer
H.no 189 Near Mahindra Showroom
Sedam Road
Kalaburagi-585105 (Karnataka)

سنجیدہ بانو

نظم

وہ ایک آواز

وہ ایک آواز
میری روح کی پنہائیوں سے لپٹی ہے
وہ ایک آواز
میری تنہائیوں سے لپٹی ہے
وہ ایک آواز
میری سماعت کی رعنائیوں سے لپٹی ہے
وہ ایک آواز
جو میرے قلب کی گہرائیوں سے لپٹی ہے
وہ ایک آواز
جو میرے جذبوں کی آسائشوں سے لپٹی ہے
وہ ایک آواز
میرے احساس کو گرماتی ہے
اٹھتے۔ بیٹھتے، چلتے، پھرتے ایک۔ ایک پل
مجھے جینے کا حوصلہ دیتی ہے یہ آواز
میں کیسے بھول سکتی ہوں
پھولوں کی مانند شگفتہ آواز
صرف میری ماں کی ہو سکتی ہے
یہ آواز میری ماں کی ہے!!

Sanjeeda Bano
Urdu Lecturer
Fatehpur-212601 (U.P)
Mob: 6387147953

حفصہ انصاری

غزل

آئینے پر جو سنگ اٹھائیں گے
صورتیں اپنی بھول جائیں گے

ساتھ سایہ بھی چھوڑ جائے تو
پھر کسے ہم سفر بنائیں گے

جانے والوں سے بارہا پوچھا
کچھ بتاتے نہیں کب آئیں گے

پیڑ پودے پہن چکے ہیں لباس
اگلی بارش میں پھر نہائیں گے

عمر خوابوں میں کٹ گئی ساری
کیا کمایا ہے جو گنوائیں گے

ہیں سبھی دودھ کے دھلے حفصہ
آپ کس کس کو آزمائیں گے

Hafsa Ansari
203 Haroon Nagar
Near Merja Masjid
Nadiyapar, Shanti Nagar
Bhiwandi
Distt. Thane- 431132 (M.S)

احساس نایاب

چوتھا نکاح

زینب بیحد خوش نظر آرہی تھی، یوں لگ رہا تھا مانو قوس وقزح کے سارے رنگ زینب کے وجود سے لپٹ رہے ہیں اور پھولوں کی گلابی ایک بار پھر اُس کے گالوں پر آچکی ہے ہاتھوں اور پیروں پر بکھرے حنا کے رنگوں نے تو جیسے زینب کے حُسن کو مزید نکھار دیا تھا، اُس پر ماتھے پر مانگ ٹیکا، ناک میں بڑی سی نتھ، ہونٹوں پہ لگی لالی اور سُرخ گھاگرے میں تو آج وہ قیامت ڈھا رہی تھی۔۔۔۔۔۔

ایسے میں بچاس سالہ زینب کا حسن اور اُس کا چوتھا نکاح آج تقریب میں شریک سارے مہمانوں کے لیے موضوع بحث بنا ہوا تھا۔

ہوتا بھی کیوں نہیں پچاس سالہ عمر میں چوتھا نکاح اُس پر چہرے پہ اس قدر چمک، ایسی لالی کسی کسی کو نصیب ہوتی ہے شرارتی فائضہ نے ہلکا سا قہقہہ لگاتے ہوئے طنزیہ لہجے میں کہا۔۔۔۔۔۔

اتنے میں پاس کھڑی منہ پھٹ گلناز کیسے چُپ رہتی وہ بھی جھٹ سے بول پڑی۔

ارے فائضہ میری جان یہ چمک پارلر والی باجی کے ہاتھوں کا کمال ہے۔

پورے 45 ہزار لے کر چار گھنٹوں کی مشقت اور دو کلو سے زیادہ کریم پاؤڈر خرچ کرنے کے بعد ملی ہے تاکہ چوتھے مالدار میاں جی ہمیشہ بیوی کے پلو سے بندھے رہیں۔

گلناز کی بات سُن کر وہاں موجود سارے مہمان دبی دبی ہنسی ہنسنے لگے کہ اتنے میں زینب کا اکلوتا بیٹا نو سالہ عیان روتے ہوئے آیا وہ دلہن بنی اپنی ماں کو پورے گھر میں تلاش کر رہا تھا کئی دفعہ زینب کے کمرے میں بھی جا چکا تھا جہاں پارلر والیوں کے ہاتھوں وہ سجائی جا رہی تھی لیکن آج وہ اپنی ماں کو پہچان نہ سکا اور مایوس پریشان ہو کر روتے ہوئے پورے گھر میں اپنی ماں کو ڈھونڈتا رہا۔

باپ کی وفات کے بعد ہمیشہ اپنی ماں کے آنچل سے لپٹا معصوم عیان آج ایک بار پھر اپنے ہی گھر میں خود کو تنہا محسوس کر رہا تھا۔

بچہ کی سہمی نظریں مہمانوں کو چیرتی ہوئی اپنی ماں کو تلاش کر رہی تھیں کہ اتنے میں سامنے سے دلہن کی ماں یعنی عیان کی نانی منہ میں پان چباتے ہوئے آئی اور پروین کو زوردار آواز دے کر اپنے نواسے عیان کو اندر لے جانے کا کہہ کر خود مہمانوں کی مہمان نوازی میں لگ گئیں۔

پروین سال بھر سے زینب کے گھر پہ کام کر رہی تھی اور ان دنوں شادی کی رسومات کی وجہ سے یہیں پر رُکی ہوئی تھی۔ شادی والے گھر میں پروین واحد فرد تھی جو عیان کی بے بسی، اُس کے اندر ماں سے جدائی کے کرب کو محسوس کر رہی تھی۔

پروین خود چار بچوں کی ماں تھی، بھری جوانی میں ہی ایک حادثہ میں اُس کے شوہر کی موت ہوگئی جس کے بعد وہ زینب کے گھر کام کر کے اپنا اور اپنے چار چھوٹے چھوٹے بچوں کا پیٹ بھر رہی تھی۔

بے سہارا غربت کی ماری لیکن دیکھنے میں بیحد حسین و جمیل پروین کے لیے کئی رشتے آئے لیکن اس غریب ماں نے بچوں کی خاطر ٹھکرا دیے اور چیل کی طرح اپنے بچوں کو محبت بھرے پنکھوں میں سمیٹ لیا، محض چھبیس سالہ عمر میں بیوہ ہونے کے باوجود اُس نے اپنے بچوں کو بکھرنے نہیں دیا، اولاد کی خاطر اپنی بھری جوانی قربان کر دی۔

آج عیان کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر اُس غریب ماں کا کلیجہ کٹ گیا اُسے عیان کے چہرے میں اپنے بچوں کا چہرہ نظر آیا، اُس نے آگے بڑھ کر عیان کو اپنے دونوں بازوؤں کے گھیرے میں سمیٹ کر سینے سے لگا لیا اور عیان کی بندھی بندھی ہچکیوں کے ساتھ دل ہی دل میں خود بھی رونے لگی۔

تھوڑی ہی دیر میں بڑے سے لان میں دلہے کے ساتھ قاضی صاحب تشریف لے آئے اور نکاح کی رسومات ادا کی گئیں

مہمان دولہے میاں سے ایک ایک کر کے مصافحہ کرتے، گلے مل کر نئی زندگی کے لیے مبارکبادیاں دے رہے تھے۔

دلہے میاں کو دیکھنے کی خواہش میں خواتین اندر کے کمرے سے تانک جھانک کرتے ہوئے دلہن کی ماں سے دلہے کے بارے میں پوچھ رہی تھیں۔

سفید شیروانی پہنے، گندمی رنگت، لمبا چوڑا قد اور پختہ جسامت والے 60 سالہ دولہے میاں عورتوں کی نگاہوں سے چھپنے کر خود کو بچانے کی کوشش کرتے۔

وہیں عیان کی نانی یعنی دلہن کی ماں اپنے دائیں گال میں پان کا گولہ دبائے بیحد سست تھکے تھکے سے لہجے میں عورتوں سے کہہ رہی تھی۔

بھئی کیا کیا جائے ہماری زینب کے تو نصیب ہی کھوٹے ہیں،

پہلا شوہر ایک نمبر کا ظالم تھا اُس پر شادی کے بارہ سال تک میری بچی اولاد سے محروم رہی، کئی چوکھٹوں پر نیازوں مرادوں منتوں کے بعد اللہ نے زینب کی سونی گود بھر دی اور اولاد کی نعمت سے نوازہ

میری بچی کو ابھی اولاد کا سُکھ ملا نہیں تھا کہ علالت کے چلتے پہلا شوہر انتقال کر گیا، آخر جوان بیٹی کو میں کب تک بیوہ کی شکل میں دیکھتی، بہت سمجھا بجھا کر دوسرا نکاح کروایا تا کہ عیان کو بھی باپ کی شفقت مل جائے۔

لیکن تینوں نکاح ناکام ہونے کی وجہ سے میری زینب جیسے ٹوٹ ہی گئی تھی، اُس نے تو شادی کا ارادہ ہی چھوڑ دیا تھا لیکن باپ کی محبت سے محروم اپنی اولاد کی صورت دیکھ کر ماں نے اپنے کلیجہ پر پتھر رکھ لیے اور شادی کے لیے حامی بھر دی۔

ویسے دلہا پچھلوں کی طرح مالی حالت میں کافی اچھا ہے، دبئی میں خود کا اچھا خاصا کاروبار ہے، ساری فیملی وہیں پر سیٹل ہے، پہلی بیوی فوت ہوچکی ہے، جس سے چار مرد بچے ہیں جو الحمدللہ جوان ہیں اور باپ ہی کے ساتھ رہتے ہیں۔

ان کے علاوہ دولہے کے آگے پیچھے کوئی نہیں ہے بچوں کی شادیوں کے بعد وہ بھی تنہا رہ جائیں گے بس دونوں کی اُجڑی زندگی سنور جائے۔

لیکن وہ نکاح کم عرصے میں ہی ناکام ہوگیا، تیسرا نکاح بھی اسی نیت سے کروایا، دیکھے بھالے خاندان کے ایک شریف النفس شخص کے ساتھ بڑی ہی سادگی کے ساتھ لیکن موصوف نے نکاح کے فوراً بعد گرگٹ کی طرح اپنے رنگ بدلے۔

خیر قسمت کی بات ہے۔

لیکن تینوں نکاح ناکام ہونے کی وجہ سے میری زینب جیسے ٹوٹ ہی گئی تھی، اُس نے تو شادی کا ارادہ ہی چھوڑ دیا تھا لیکن باپ کی محبت سے محروم اپنی اولاد کی صورت دیکھ کر ماں نے اپنے کلیجہ پر پتھر رکھ لیے اور شادی کے لیے حامی بھر دی۔

ویسے دلہا پچھلوں کی طرح مالی حالت میں کافی اچھا ہے، دبئی میں خود کا اچھا خاصا کاروبار ہے، ساری فیملی وہیں پر سیٹل ہے، پہلی بیوی فوت ہوچکی ہے، جس سے چار مرد بچے ہیں جو الحمدللہ جوان ہیں اور باپ ہی کے ساتھ رہتے ہیں۔

ان کے علاوہ دولہے کے آگے پیچھے کوئی نہیں ہے بچوں کی شادیوں کے بعد وہ بھی تنہا رہ جائیں گے بس دونوں کی اُجڑی زندگی سنور جائے۔

اتنے میں رشیدہ نے مداخلت کرتے ہوئے کہا، خالا دلہے میاں کے بچے تو جوان ہیں، شادی میں بھی کہیں نظر نہیں آرہے، کل کو ایسا نہ ہو وہ ہماری زینب کو اپنانے سے انکار کردیں ویسے بھی دور کا معاملہ ہے۔

رشیدہ کی بات پہ زینب کی ماں جھلا اٹھی، منہ میں دبا پان پاس کے ٹیبل پہ رکھے اگالدان میں تھوکتے ہوئے کہنے لگی۔

ری موئی رشیدہ کچھ اچھا نہ کہہ سکتی تو منحوسیت بھی نہ پھیلا الحمدللہ دولہے میاں خودمختار ہیں خدا کا نوازہ اُن کے پاس سب کچھ ہے بنگلہ گاڑی، نوکر چاکر یہی سب کچھ دیکھ بھال کر بہت سوچنے کے بعد ہم لوگوں نے رشتہ کے لیے ہاں کہا ہے۔ جا جا کر کھانا ٹھونس۔ رشیدہ اپنا سا منہ بنائے وہاں سے نکل گئی۔

رشیدہ کی بڑی بہن شکیلہ نے خالا کے غصے کو بھانپتے ہوئے فوراً بات کو بدلتے ہوئے کہا۔

خالا چھوڑیں آپ کہاں اُس جاہل رشیدہ کی باتوں پر اپنا جی جلا رہی ہیں تھوکیں غصہ آج تو خوشی کا دن ہے۔

شکیلہ کا دلاسہ پاکر اب کی بار خالا کچھ زیادہ جذباتی ہوگئی اور دوبارہ خواتین کے بیچ زینب کے نام کے قصیدے پڑھنے لگی۔

ارے شکیلہ اس ماں کا درد میں تجھے کیسے بتاؤں، میری بچی نے لڑکے کی شکل وصورت کو بھی زیادہ فوقیت نہیں دی۔۔۔۔ ویسے دولہے میاں دیکھنے میں بس ٹھیک ٹھاک سے ہیں، عمر میں بھی زینب سے پانچ سال بڑے ہیں لیکن نصیب کے آگے کیا کیا جائے۔

ہماری زینب نے تو اپنی اولاد کی خاطر سمجھوتہ کرلیا ہے ورنہ وہ تو شادی کے لیے بالکل بھی تیار نہیں تھی، وہ تو بیٹے کو باپ کی محبت دلوانی تھی سو حالات کے آگے زینب نے قربانی دے دی۔

خیر چھوڑیں یہ ساری باتیں آپ سبھی ضرور کھانا کھا کر جائیں میں ذرا باقی مہمانوں کو بھی پوچھ لیتی ہوں۔

یہ کہہ کر دلہن کی ماں دیگر مہمانوں کے پاس چلی گئی۔

ملنے ملانے اور مبارکبادیوں کا سلسلہ چلتا رہا۔

تھوڑی ہی دیر میں کھانے کا بھی انتظام کیا گیا۔۔۔ سارے مہمان شیخ بوٹی اور دیگر لوازمات سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

دلہا دلہن بھی ساتھ بیٹھ کر ایک ہی تھالی میں کھانا کھا رہے تھے آس پاس کھڑی ادھیڑ عمر کی خواتین شوقیہ نظروں سے سرگوشیاں کرتی ہوئی دلہا دلہن کو چھیڑ رہی تھیں۔۔۔۔ ان کو دیکھ کر ایسا لگ رہا تھا مانو آج ان عورت کے بھی ارمان مچل رہے ہیں

وہیں دور دیوار کے کونے سے ٹیک لگائے کھڑا عیان آج اپنے ہی گھر میں اجنبی سا لگ رہا تھا اور اپنی ماں کو اجنبی شخص کے ساتھ ایک تھالی میں کھانا کھاتا دیکھ کر بچہ کے معصوم جذبات ایک بار پھر دھرے کے دھرے رہ گئے۔

کل تک ماں کی گود میں سر رکھ کر کہانیاں سنتے ہوئے، اپنی ماں کے ہاتھوں سے کھانا کھانے والا معصوم بچہ آج صبح سے بھوکا پیاسہ ماں کا انتظار کرتے ہوئے نہ جانے کب جا کر کمرے میں ماں کے دلائے بے جان کھلونے کو خود سے لگائے تنہا سو گیا۔

شادی کی گہما گہمی میں وہ معصوم جیسے کھو سا گیا تھا۔

درمیانی شب ماں سے جدائی کے خیال نے جب ڈراؤنے خواب کی شکل اختیار کی تو زوردار چیخ کے ساتھ عیان کی نیند بیدار ہوگئی، گول گول آنکھوں میں موٹے موٹے آنسوؤں کی لڑی جیسے تھمنے کو تیار نہ تھی، دائیں ہاتھ میں ماں کا دلایا کھلونا تھامے، بائیں ہاتھ کی چھوٹی سی آستین سے بڑی بڑی آنکھوں سے بہتے موٹے موٹے آنسو پونچھتے ہوئے اندھیرے کمرے سے باہر نکل کر سامنے ہی پھولوں سے سجے ماں کے نئے کمرے کے دروازے کو سر لگائے ساری رات بیٹھا رہا۔

صبح فجر کی اذان کے بعد پروین معمول کے مطابق کچن کے جھوٹے برتن صاف کرکے جھاڑو لگاتی ہوئی کمرے کے پاس پہنچی تو عیان کو دروازے پر ٹیک لگا کر نیم سُدھ بیٹھا دیکھ کے تڑپ اٹھی۔

ہاتھ میں پکڑی جھاڑو ایک طرف پھینک کر عیان کو اپنی گود میں اُٹھایا اور کمرے میں لے جا کر بستر پہ سُلا دیا اور بدن پر رضائی اڑھادی۔

صبح فجر کی اذان کے بعد پروین معمول کے مطابق کچن کے جھوٹے برتن صاف کرکے جھاڑو لگاتی ہوئی کمرے کے پاس پہنچی تو عیان کو دروازے پر ٹیک لگا کر نیم سُدھ بیٹھا دیکھ کے تڑپ اٹھی۔

ہاتھ میں پکڑی جھاڑو ایک طرف پھینک کر عیان کو اپنی گود میں اُٹھایا اور کمرے میں لے جا کر بستر پہ سُلا دیا اور بدن پر رضائی اڑھادی۔

تھوڑی دیر وہ عیان کے سرہانے کھڑی اُس کے معصوم چہرے کو دیکھتی رہی۔۔۔ گلابی گالوں پر پڑے آنسوؤں کے دھبے چیخ چیخ کر شکایت کررہے تھے پروین کرتی بھی کیا وہ خود قسمت کی ماری ایک معمولی سی نوکرانی تھی۔

خیر وہ عیان کے سرہانے بیٹھ گئی اور محبت سے اُس کے سر پہ ہاتھ پھیر کر کمرے سے باہر نکل آئی۔

دن بھر کا بھوکا پیاسہ عیان۔

رات بھر ڈر خوف اور بے چینی کے عالم میں صبح جاگا تو اپنی آنکھیں رگڑتا ہوا ماں کو پکارتے ہوئے دوبارہ کمرے سے باہر آیا،

سامنے زینب اپنے نئے شوہر کے ساتھ ہمیشہ کے لیے دبئی جانے کے لیے تیار ہو کر کھڑی تھی، پاس میں دو بڑے بڑے سوٹ کیس پڑے تھے۔

اور نانی دعاؤں کے ساتھ اپنی بیٹی اور داماد کی بلائیں لے رہی تھی

ادھر پہلے سے باپ کی محبت سے محروم عیان آج ماں کی ممتا بھرے آنچل سے بھی محروم ہونے جارہا تھا۔

رات بھر چیختا پکارتا عیان اب مکمل خاموش ہوچکا تھا، اُس کے درد نے چیخنے سے انکار کردیا، آنکھوں میں آنسوؤں نے بغاوت کردی، بے بس مجسم بنا اپنی ماں کو بس دیکھے جارہا تھا، عیان کی بے بس آنکھوں میں آنسوؤں کے ساتھ ساتھ اپنی ماں کے لیے سینکڑوں بے زبان شکایتیں بھی تھیں کیونکہ عیان کے بے انتہا درد نے اس لمحہ اُسے اتنا خاموش کردیا تھا کہ وہ اپنی ہی دھڑکنوں کی آواز سے خوفزدہ ہوچکا تھا۔

رات بھر چیختا پکارتا عیان اب مکمل خاموش ہوچکا تھا، اُس کے درد نے چیخنے سے انکار کردیا، آنکھوں میں آنسوؤں نے بغاوت کردی، بے بس مجسم بنا اپنی ماں کو بس دیکھے جارہا تھا، عیان کی بے بس آنکھوں میں آنسوؤں کے ساتھ ساتھ اپنی ماں کے لیے سینکڑوں بے زبان شکایتیں بھی تھیں کیونکہ عیان کے بے انتہا درد نے اس لمحہ اُسے اتنا خاموش کردیا تھا کہ وہ اپنی ہی دھڑکنوں کی آواز سے خوفزدہ ہوچکا تھا۔

اتنے میں ائیر پورٹ جانے کے لیے گھر کے باہر کار آکے رُکی دولہے میاں سب سے اجازت لے کر اپنا اور بیوی کا سامان کار میں رکھنے کے لیے باہر آگئے۔

زینب عیان کے پاس آئی، آنسوؤں سے تر اُس معصوم کے چہرے کو اپنے دونوں ہاتھوں میں لیا، اُس کے ننھے سے ماتھے کو چومتے ہوئے خود بھی رو پڑی اور مجسم بنے اپنے بچے کو کس کر سینے سے لگالیا۔۔۔ ماں کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر ایک بار پھر مجسم۔ بنے عیان کی ہچکیاں بندھ گئیں۔

وہ ماں کو چیخ چیخ کر کہنا چاہتا تھا کہ وہ اُسے خود سے جدا نہ کرے، اُسے تنہا چھوڑ کے نہ جائے، وہ اُسے بھی اپنے ساتھ لے جائے وہ کبھی اُسے پریشان نہیں کرے گا، نہ ہی کہانی سنانے کو کہے گا بس وہ اُسے بھی اپنے ساتھ لے جائے لیکن عیان کچھ کہہ پاتا اُس سے پہلے سینے سے لگائی ماں نے تسلی دیتے ہوئے چار پانچ مہینے میں ایک دفعہ آکر ملنے کا وعدہ کر کے ہمیشہ کے لیے اپنا آنچل اُس کے ننھے ہاتھوں سے چھڑاتے ہوئے اُس سے دور، بہت دور چلی گئی۔

اور دروازے پہ کھڑا عیان سینہ میں درد کا غبار دبائے بے بس آنکھوں سے اپنی اُس ماں کو خود سے دور جاتا دیکھ رہا تھا جس نے اپنی اولاد کی خاطر سمجھوتہ کیا تھا۔

وہیں لان میں لگے بڑے نیم کے پیڑ کے سائے میں غریب پروین اور اُس کے چاروں بچے پھٹے پرانے کپڑے پہنے اپنی ماں کے ارد گرد بے فکر کھیل رہے تھے اور پروین اپنے ہاتھوں سے کھانے کا نوالا بنا بنا کر اپنے بچوں کو کھلا رہی تھی یوں بچوں کے چہروں پہ ہتھیلی خوشی دیکھ کر ایسا محسوس ہورہا تھا مانو ان کے لیے آسمان کی جنت زمین پہ اُتر آئی ہو اور وہ جنت کے باغوں میں جھولہ جھولتے ہوئے جنت کے میوے کھا رہے ہیں۔

□□□

Ahsas Nayab
C/o- Md Asif
KR Puram extension
Opposite Rama Temple
Shimoga-577202 (Karnataka State)
Ph-7975189131
Email-ehsasnayab786gmail.com

کہانیاں

نئی صبح

صائمہ پروین شمیم

جگو نے ایک نگاہ لہلہاتے ہوئے کھیت پر ڈالی، گیہوں کی بالیاں پک کر تیار ہو چکیں تھیں، جو ہوا سے آپس میں ٹکرا کر پائل کی طرح بج رہی تھیں۔ وہ روز کھیت کا چکر لگاتا، اور اپنے من میں بڑی اداسی اور پریشانی ظاہر کرتے ہوئے سوچتا کہ کب فصل کٹے گی اور کب میں بھوسا کھیت سے لے جاؤں گا، اور وہاں سے جب واپس لوٹتا تو کہتا:

”اپنے ہاتھ میں اگر پیسا ہوتا تو ہم کا اس بڑھاپے میں اس طرح بھوسے کے لیے چکر لگانے ناہی پڑتا۔“

گھر میں آخر ہے ہی کون ایک بوڑھا ہے اور ایک بوڑھی ہے، ان دونوں کے یہ دن بھی کسی نہ کسی طرح کٹ ہی جائیں گے جو زندگی گزر گئی وہ بھی کون آرام سے گزری تھی بڑی پریشانیوں میں دن کٹے بس کٹ گئے، بیٹا اور بہو تھے جو بوڑھاپے میں تھوڑا بہت آرام ملتا لیکن وہ بھی شہر میں رہنے کے لیے چلے گئے تھے، بہو کا کہنا تھا کہ میرا بیٹا شہر میں پڑھے گا، گاؤں کے اسکول میں پڑھے گا تو کچھ بھی نہیں سیکھ پائے گا، جب ساتھ رہتی تھی کاظم کا خیال بھی نہیں رکھتی کہ کھانا کھایا بھی ہے یا نہیں اپنے شوق سنگار سے ہی اس کو فرصت نہیں تھی، ایک بار کاظم کی حالت نازک ہو گئی تو بوڑھیا نے سوچا کہ بلا کر اسے کھانا کھلا دے لیکن بہو تاک میں رہتی اور کہتی۔

”نہ جانے کیا کھلا دے میرے پتی کو پھوک پھکوا کر جرور (ضرور) لائی ہو گی، اس نے کاظم سے کہہ رکھا تھا کہ اگر وہاں گئے تو میں پانی تک یہاں کا پینے نہیں دوں گی۔“

کاظم کو اس نے اپنے بس میں کر رکھا تھا، ایک 6 سال کا پوتا تھا گلو، اس نے سوچا چلو اسی سے اپنا دل بہلاتا رہے گا مگر اسے بھی دور رکھتی تھی اسے ڈر تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ کاظم یہ سب دیکھ کر من نہ بدل لے۔

جگو کھیت کا چکر لگا کر واپس آیا اور پیپل کی چھاؤں میں آ کر بیٹھ گیا اس کا پورا بھار درخت پر تھا۔ یہاں پڑوس کا ہی شیخ بھی بیٹھا تھا، اسے پیسوں کی کمی نہیں تھی اس کے پاس اپنا کارخانہ تھا لیکن بوڑھے کو اس سے کیا فرق پڑتا..... پھر بھی جگو نے بیڑی پھونکتے ہوئے شیخ سے پوچھا۔

”صاب! چائی پی ہو کا، گھر سے بنوا کے لاوے۔“

شیخ مسکراتے ہوئے بولا۔ ”ناہی رے جگو رہنے دے، کھانے کے لیے تورے پاس پیسے نہیں، اور تم ہم کا چائی پیلا ہیو۔“

شیخ کی بات سن کر جگو کی آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبا گئیں اور آہستہ سے بولا۔

”ویسے بھی ہم گریبے گھر کی چائی امیر لوگ ناہی پیتے ہیں۔“ کہتا ہوا وہاں سے چلا آیا اور گھر آ کر چارپائی پر بیٹھ گیا، چارپائی بھی ٹوٹی ہوئی تھی، جس کا ایک پایا ہی نہیں تھا اس کی جگہ پر اس نے ایک بانس کا موٹا ٹکڑا لگا دیا تھا۔

بوڑھیا انگیٹھی پر کھانا بنا رہی تھی جس سے پورے گھر میں دھواں بھرا ہوا تھا، وہ پنکھے سے انگیٹھی جھل رہی تھی کہ آنچ ہو جائے تو دھواں کم ہو

جائے گا وہ پنکھا جھلتے جھلتے بڑبڑانے لگی۔

''تم کب آئے بوڑھو، کچھ فکر وکر ہے کہ نہیں تم کو سنگھی ساتھی کے ساتھ بیٹھنے سے فرصت ہی نہیں ہے۔''

جگو نے سر کھوجاتے ہوئے کہا۔''ارے بوڑھیا تو بڑی بکر بکر کرے ہے، تیرے پاس اس کے علاوہ کوئی کام نہ ہی، گئے لی تھے ناکھیت، فصل ابھی نا ہی کٹ لئی ہے پھسل (فصل)، جب کٹ جائیوے، تو لے آویں گے بھوسا۔''

''ہاں ہاں ہمار پاس تو جیسے کوئی کام دھام نا ہی ہے، تم ہی بوڑھو جیسے سب کام کرتے ہو۔''

بڑھیا کھانا پکا رہی تھی اور بڑبڑا بھی رہی تھی، وہ جس جگہ بیٹھ کر کھانا پکا رہی تھی وہاں پر کچھ ٹوٹی اور گندی کچی رقابیاں رکھی ہوئی تھیں اور اس میں مکھیاں اپنا قول لیے بھن بھنا رہی تھیں، چائے کی جوٹھی پیالیاں ادھر ادھر پڑی ہوئی تھیں، جو اس نے دھونے کے لیے رکھی تھیں۔ وہ جس چٹائی پر بیٹھی تھی وہ پھٹی ہوئی تھی، اس میں جگہ جگہ چھید تھے، اس پر انگیٹھی سے راکھ اڑ کر پھیلی ہوئی تھی اور اپنے آپ یہ کہے جا رہی تھی۔''بھوریا بھی تھی تو ہمار کا جم (کاظم) کو ساتھ لے کر چلی گئی، اب ہم اکیلے کا کا دکھیں اور کا کا سنبھالیں، گھر چھوڑ کر کسی کے پاس بھی نہیں جا سکت، تھوڑا بہت پڑوس میں جا کر دلوا کا بات سات کر سکیں کہ منوا ہلکا ہو جائے، اب ہمار سے کام دھام نہیں ہووے ہے''۔

جگو بازار جانے کے لیے اپنی سائیکل سہی کر رہا تھا، اس پر ساری سبزی لادی اور جانے کے لیے تیار باہر کھڑا تھا۔''اچھا ہم جا رہے ہیں۔''

اتنے میں اندر سے بڑھیا بولی۔''ارے بوڑھو جا رہے ہو، سبجی (سبزی) بکے گی تو واپس لوٹتے وکت تھوڑا گیہوں چاول لے آنا گھر میں کھانے کے لیے ایک دانا نہیں ہے۔''

''ٹھیک ہے لے آویں گے۔''

جگو کے پاس دو کام تھے موسم گرم میں تھوڑی بہت سبزی بیچ لیتا تھا اور سردی میں اس کا کام تو تھا ہی آہستہ آہستہ گرمیوں کے دن اسی طرح گزرے کہ ٹھنڈی میں بوڑھے نے مونگ پھلی کا کام شروع کر دیا۔ اس نے بھاڑ سہی کیا آدھے سال تک تو وہ ایسے ہی پڑا رہتا ہے ٹھنڈ شروع ہوتے ہی بھاڑ کو سہی کرتا۔ بھوسا تو وہ کھیت سے لے آیا تھا۔ مونگ پھلی ٹھنڈی میں بیچتا تھا وہ پہلے ہی منڈی سے مونگ پھلی کے کئی بورے منگوا لیتا اور اس کے لیے بھی بہت محنت لگتی تھی، بڑھیا جنگل سے لکڑیاں اور سوکھے پتے لانے کے لیے الصبح گھر سے نکل جاتی۔ لکڑی اور سوکھے پتے آہستہ آہستہ بینتی اور ڈھیر لگا دیتی، اسی جنگل کے پاس ایک بڑا تالاب تھا وہ اسی تالاب کنارے بیٹھ جاتی کچھ دیر آرام کرنے کے لیے۔

تالاب کے کچھ دوری پر کھجور، اور آم کے درخت تھے۔ بڑھیا کچھ ادھ سوکھی ہری گھاس پر بیٹھی روتی رہتی، جب دل ہلکا ہو جاتا تو اپنا لکڑی کا گٹھر اٹھاتی اور چل دیتی۔ وہ شام پانچ بجے تک گھر آ جاتی اور مونگ پھلی بھوننے کے لیے، اور مٹی کے بھاڑ کے پاس سر سے لکڑی کا بوجھ زور سے پٹخ دیتی، پھر جگو کو آواز دیتی۔

''اے بوڑھو، مونگ پھلی اندر سے اٹھا کر لاؤ۔''

''پہلے تم بھاڑ میں لکڑی بھر کر جلاؤ ہم لے کے آویں ہیں۔''جگو نے بیری سلگاتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

دونوں مل کر مونگ پھلی بھوننے لگتے ہیں، جگو بھونتا اور بڑھیا بھاڑ میں پتے اور لکڑی جلدی جلدی رکھتی چلی جاتی۔ زیادہ بھرنے سے دھواں بہت ہوجاتا لیکن اندر ہی اندر آگ اتنی بن جاتی کہ جلنے میں نہیں لگتا اتنی تیز جلتا کہ لو بھاڑ سے باہر آجاتی اور بڑھیا دور کھسک جاتی، بنا چپل کے ہی ہوتی اور پیچھے جب کھسکتی تو اس کے پیچھے کا کرتا پیروں کے نیچے آجاتا۔

دونوں مل کر مونگ پھلی بھوننے لگتے ہیں، جگو بھونتا اور بڑھیا بھاڑ میں پتے اور لکڑی جلدی جلدی رکھتی چلی جاتی۔ زیادہ بھرنے سے دھواں بہت ہوجاتا لیکن اندر ہی اندر آگ اتنی بن جاتی کہ جلنے میں نہیں لگتا اتنی تیز جلتا کہ لو بھاڑ سے باہر آجاتی اور بڑھیا دور کھسک جاتی، بنا چپل کے ہی ہوتی اور پیچھے جب کھسکتی تو اس کے پیچھے کا کرتا پیروں کے نیچے آجاتا۔

''دیکھ کے نہیں تو نالی میں ہی جاوے گی سیدھا۔''

''تم چاہتے ہی ہو نہ نالی میں گر جائیں۔''بڑھیا غصہ سے بولی۔

جب مونگ پھلی بھن جاتی تو جگو ٹھیلے پر لے کر گھر سے نکل جاتا اور کچی سڑک کے کنارے پر لگاتا، گاؤں کے لوگ تو خریدتے ہی جو سڑک سے گزرتا وہ بھی اپنے گھر کے لیے لے جاتا تھا۔ گاؤں کے لوگ ٹہلتے ٹہلتے چلے جاتے تھے، جگو اسی بہانے کچھ باتیں کر لیتا، کسی سے حال خبر لیتا گھر

کی۔ایک روز گاؤں کا عمران جگو سے مونگ پھلی لینے آیا تو اس نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

آواعمران ببوآسب ٹھیک بانہ،سنت ہے کسی سے لڑائی ہوگئیلبا تہار سے۔''

''ہاں چچاوہی سکیلوا(شکیل) سے۔''

''کابات ہوگئیلبا۔''

''ارے کا بتاویں چچا راستے کا لے کر لڑائی ہوئی تھی ،اب دیکھو جس جگہ پر نکلنے کا راستہ تھا،وہیں سے سکیلوا(شکیل) نے اپنی نیو اٹھالی ،بس اسی میں بحث ہونے لگی، بڑھتے بڑھتے اور تیز ہوگئی، پھر بات تھانے تک پہنچ گئی۔''

''اچھا اب معاملہ سہی ہوگیا نا ببوآ۔''

''ہاں چچا ہوگیا۔''

جگو کی مونگ پھلی بکی، باقی بچتی وہ گھر لے کر چلا آتا، بڑھیا بیچاری راہ تکتی رہتی گھر میں صرف ایک ڈبیہ تھی جو دھیرے، دھیرے جل رہی تھی، جو ہوا سے دپ دپلا رہی تھی۔کچی دیواروں سے پلی بندی ہوئی تھی وہ بھی سرد ہوا سے تھوڑی تھوڑی پھڑ پھڑا رہی تھی اور بڑھیا پریشانی ظاہر کرتے ہوئے کہتی۔''نہ جانے کب آویں گے میرے بوڑھو۔''

اتنے میں آہٹ سنائی دی۔''لو آگئے ہمرے بوڑھو۔''بڑھیا نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

''آؤبوڑھیو سامان اٹھوالو۔''جگو نے آتے ہی آواز دی۔

''اچھا آبت ہیں بوڑھو۔''

اسی کے ساتھ ساتھ سردی بڑھتی گئی جگو مونگ پھلی اب گلی گلی میں بیچنے جایا کرتا تھا، جب آتا تو دور سے اس کی سائکل میں بندھی ایک روشنی دکھائی دیتی وہ لالٹین تھی گلیوں میں اندھیرا رہتا تھا،اس لیے وہ لالٹین بھی ساتھ لے کر چلتا تھا۔

آواز دیتا ہوا آتا.....فی فے .....فی فے.....کراری فی فے۔''

کڑک آواز جو سننے میں بہت ہی اچھی لگتی تھی ایسا لگتا کوئی راہ پر چلنے والا ایسا انسان ہے، جسے سن کر من کو سکون سا ملتا کہ زندگی کتنی حسین ہے بس یوں ہی چلتی رہے۔

جس کو مونگ پھلی لینی ہوتی وہ لے لیتا ،پھر وہ آواز دیتا ہوا چلا جاتا۔ایک روز تیز بارش ہورہی تھی سردی بھی بہت تھی ہوا بھی ٹھنڈی چل رہی تھی جگو ابھی تک مونگ پھلی لے کر نہیں آیا تھا، کیوں کہ اس کے بھاڑ ٹوٹ گئے تھے۔اس نے سوچا آج تالاب سے مٹی لاکر مونگ پھلی کا بھاڑ سہی کرنا ہے، دوپہر تک وہ مٹی لے آیا اور بڑھیا سے کہا۔

''بوڑھیو، چل آجا جلدی جلدی بنالیں نہیں تو سوکھنے میں وکت (وقت) لگے گا۔''

''اے بوڑھو کل سے کام شروع کریو، ہمرا من اچھا نہیں ہے۔''بڑھیا تھکی ہوئی آواز میں بولی۔

''کا ہوا بوڑھیو تہار من ٹھیک ہئی نا۔''جگو نے بڑھیا کی پیشانی پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں بوڑھو ٹھیک ہے، چلو بنا ہی لیتے ہیں۔''بڑھیا نے اٹھتے ہوئے کہا۔

پھر دونوں نے مل کر بھاڑ ٹھیک کیا لیکن بیچارے کو کیا پتا تھا جہاں اس کا بھاڑ سوکھ رہا ہے اتنی امید سے کہ کل سے مونگ پھلی بھوننا شروع کرنا ہے لیکن اسی رات کچھ شرارتی لوگوں نے چپکے سے بھاڑ کو توڑ دیا۔جب صبح اٹھے تو دیکھا کہ ان کا بھاڑ ٹوٹا پڑا تھا، بڑھیا زور زور سے رونے لگی اب کیا ہوگا کیا کریں گے کوئی تو ان کی سننے والا نہیں تھا، سب کو صرف اپنے بارے میں سوچنا تھا کسی کا کچھ بھی بگڑے کیا فرق پڑتا ہے۔وہ دونوں صبح کا انتظار کررہے تھے کہ اب کل سے ہمارا کام شروع ہوجائے گا۔

''تم اپنا ٹھیلا سہی کرلو تا کہ اس سے چھٹی مل جائے۔''بڑھیا نے کہا

''اچھا ٹھیک ہے، صبح ہوئی تو یہ سب، اگر کام ہوجاتا لے کر جاتا۔''

جگو نہ ٹھنڈی دیکھتا نہ بارش اپنا کام کرتا ہر سال کا یہی کام تھا۔وہ جب بھی گلی میں آتا اپنی کڑک آواز دیتا ہوا آتا۔

''مچھلی۔مچھلی۔مچھلی''وہ آواز دیتا ہوا دھیرے دھیرے دور تک نکل جاتا ،رہ جاتی بس تو اس کی لالٹین جھل مل ،جھل مل کرتی ہوئی روشنی۔جو جگو کے دور جانے سے بھی روشن دکھائی دیتی، جیسے کچھ کہہ رہی ہو مسکرا رہی ہو،بس یہ احساس دے جاتی کہ کل نئی صبح کا انتظار ہے۔

□□□

Sayma Parveen Shamim
S/o M H Ansari
635 Ground Floor
Back Side Kh .No.240
Gali No 22, A
Zakir Nagar
New Delhi-110025
Mob: 9873289275

شکیلہ نگار

وہ جو رہ گیا

فراٹے سے پٹری پر دوڑتی دلی میٹرو جیسے ہی چاندنی چوک اسٹیشن پر رکی لوگوں کا جم غفیر بہتے پانی کی طرح اندر داخل ہو گیا۔ لیڈیز کوچ میں بھی غضب کی بھیڑ تھی۔ جتنی عورتیں سیٹ پر بیٹھی تھیں اس سے کہیں زیادہ کھڑی تھیں۔ کسی کے کندھے سے بیگ لٹک رہا تھا تو کوئی ہاتھوں میں سامان کے پیکٹس لیے کھڑی تھی۔ کوئی اپنے بچے کو سنبھال رہی تھی تو کوئی الجھی زلفوں کو۔ اتفاق سے ماہی کو سیٹ مل گئی تھی۔ وہ کانوں میں ائیر فون لگائے اپنی پسندیدہ غزل سن رہی تھی۔ ساتھ ہی ساتھ مسافروں کا معائنہ بھی کرتی جاتی تھی۔ دفعتاً اس کی نگاہ نیلی جنس اور کالی کرتی میں ملبوس ایک خاتون پر جا کر ٹھہر گئی، جو ہاتھوں میں شاپنگ بیگس تھامے اس کی طرف پشت کیے کھڑی تھی۔ پیچھے سے وہ بہت جانی پہچانی سی لگی۔ ماہی اب دوسری سواریوں کو چھوڑ کر اسے ہی دیکھے جا رہی تھی، تبھی سامنے کی سیٹ خالی ہوئی اور اس نے سرعت کے ساتھ اس سیٹ پر قبضہ کر لیا۔ ماہی کا اندازہ بالکل سہی نکلا، اب اس کے سامنے نیتو بیٹھی تھی۔ نیتو۔۔۔ جس کے ساتھ اس نے راج نگر کے اسکول میں پورے پانچ سال ملازمت کی تھی، پھر اس نے اپنا ٹرانسفر کرا لیا اور پچھلے دو سالوں سے ان دونوں کے درمیان کوئی رابطہ نہ رہا تھا۔ نیتو نے سیٹ پر بیٹھتے ہی ہاتھوں میں تھامے پیکٹس کو نیچے پیروں کے قریب رکھا، بال درست کیے، سائیڈ پرس میں رکھے موبائل کی اسکرین میں خود کو نہارا، جب اپنے حلیے سے مطمئن ہو گئی تو سر اوپر اٹھایا۔ سر اٹھاتے ہی اس کی نظر سامنے بیٹھی ماہی کی نظروں سے ٹکرائی، جو اسے ہی دیکھے جا رہی تھی۔ دونوں نے ہاتھ ہلا کر ایک دوسرے کو ہیلو کہا۔ ماہی نے ساتھ بیٹھی خاتون سے مخاطب ہو کر پوچھا۔۔۔ can you please shift to that side? اجنبی خاتون نے مسکراتے ہوئے اپنی سیٹ تبدیل کر لی۔ اب دونوں ساتھ ساتھ بیٹھی تھیں۔ ماہی نے نیتو کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور بڑے خلوص سے گویا ہوئی۔ اور بتاؤ کیسا چل رہا ہے۔ نیتو نے بڑے ہی خوش دلی سے جواب دیا۔۔۔ سب بڑھیا ہے یار۔ تم بتاؤ کیا حال ہے؟ میں بھی بالکل ٹھیک ہوں۔ پھر دونوں راج نگر میں گزرے ہوئے دنوں کو یاد کرنے لگیں۔ ماہی نے محسوس کیا بظاہر تو نیتو کے ہونٹوں پر مسلسل مسکراہٹ کھل رہی تھی، مگر آنکھوں میں پہلے والی چمک نہ رہی تھی۔ اس نے نیتو سے پوچھنا چاہا تبھی میٹرو کی دلکش آواز نے اس کا دھیان اپنی طرف کھینچ لیا۔ next station is Dwarka sec-10 ماہی ہڑبڑا کر کھڑی ہوئی اور 9974738950 میرا نیا نمبر کہتے ہوئے دروازے کی طرف لپک پڑی۔ نیتو نے اس کے بتائے نمبر پر رنگ کر دیا تھا۔ ای رکشہ پر بیٹھ کر ماہی نے موبائل نکالا اور نیتو کا نمبر فیڈ کر لیا۔ اس کی بے رونق آنکھیں کئی دنوں تک اسے پریشان کرتی رہیں۔

"اگلے اتوار کو ٹھیک تین بجے ماہی پارک پہنچ چکی تھی۔اس کی نظریں بار بار انٹرنس گیٹ کی جانب اٹھ جاتیں۔انتظار کی گھڑی واقعی بہت طویل ہوتی ہے جو گزارے نہیں گزرتی۔اس نے فون میں ٹائم دیکھا اور آہستہ قدموں سے پارک کے چکر لگانے لگی۔ابھی پہلا چکر پورا ہونے ہی والا تھا کہ سامنے سے نیتو آتی دکھائی دی۔سرخ رنگ کے پلازو پر اس نے گہرے نیلے رنگ کی کرتی ڈالی تھی۔گلے میں ملٹی کلر کا پیارا سا اسکارف تھا۔خاص انداز سے تراشے ہوئے بال شانے پر کھلے پڑے تھے۔کل ملا کر اس کی شخصیت بڑی پرکشش دکھ رہی تھی۔ماہی نے دوڑ کر اسے گلے سے لگا لیا۔کچھ دیر تک دونوں باتیں کرتے ہوئے چہل قدمی کرتی رہیں، پھر خالی پڑے بینچ پر بیٹھ گئی۔اب دونوں بالکل آمنے سامنے تھیں۔ماہی نے نیتو کی آنکھوں میں جھانکا، اسے ان آنکھوں میں پھر وہی اداسی نظر آئی۔اس نے قدرے جھجکتے ہوئے پوچھا۔۔۔نیتو سب ٹھیک تو ہے نا؟ نیتو نے الٹا اسی سے سوال کر ڈالا۔۔۔کیوں؟ کیا لگتا ہے؟ کچھ گڑبڑ ہے؟ نہیں یار۔۔۔ ایسا نہیں ہے۔۔۔بس میں نے یوں ہی پوچھ لیا۔۔۔وہ تمھاری آنکھوں کی چمک۔۔۔نیتو نے بیچ میں ہی اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔۔۔کیا ہوا میری آنکھوں کی چمک کو؟ کچھ نہیں بس وہ پہلے والی بات نہیں رہی۔نیتو نے اس کی باتوں کو ان سنا کرتے ہوئے، گھڑی پر نگاہ ڈالی اور اٹھتے ہوئے کہا۔ اب مجھے چلنا چاہیے، بہت دیر ہو چکی ہے۔ماہی چپ چاپ کھڑی ہوگئی۔گیٹ پر پہنچ کر اس نے ایک بار پھر نیتو کی آنکھوں میں جھانک لیا۔اس بار نیتو نے اپنا منہ اس کے کان کے قریب لاتے ہوئے پوچھا۔۔۔ ماہی! یہ تم نے آنکھوں کے رستے دل تک پہنچنے کی کلا کب سے سیکھ لی ہے؟ ابھی وہ کچھ کہہ پاتی اس سے قبل نیتو نے بائے کہتے ہوئے تیزی سے اپنے قدم آگے بڑھا دیے۔ماہی پورے راستے اس کے بارے میں سوچتی رہی۔ آخر ان دو سالوں میں ایسا کیا ہو گیا تھا؟ اچھی خاصی تو تھی اس کی زندگی۔بہتر کمانے والا شوہر تھا، جو اپنی کمائی کی ایک ایک پائی اس کے ہاتھوں میں رکھ دیتا۔کسی طرح کی کوئی پابندی نہیں۔کہیں بھی آجا سکتی ہے۔کسی سے بھی مل جل سکتی ہے، باتیں کر سکتی ہے، جو چاہے پہن سکتی ہے، کھا سکتی ہے، جہاں چاہے گھوم سکتی ہے۔خود بھی تو ایک اچھی نوکری کرتی ہے۔بھگوان رکھے تین بچے ہیں۔پھر اسے کس بات کا دکھ، کون سی

آج اتوار تھا۔ماہی نے جلدی جلدی گھر کے کام نپٹائے۔بالوں میں مہندی لگائی اور بالکنی میں رکھی آرام کرسی پر آنکھیں بند کیے آرام کرنے لگی۔بالکنی میں آتی گنگنی دھوپ سے جب طبیعت بحال ہوئی تو اس نے چارزنگ میں لگے موبائل کو اٹھا لیا اور بڑے اشتیاق سے نیتو کا نمبر ڈائل کر دیا۔ادھر سے نیتو کی کھنک دار آواز سنائی دی۔ہیلو ڈیئر، کیا ہو رہا ہے۔کچھ نہیں بالوں کی سفیدی کو چھپانے کے لیے مہندی لگا کر بالکنی میں بیٹھی ہوں۔اس دن کوئی بات ہی نہیں ہو پائی۔آپ تو ٹھہرے بیزی انسان۔ سوچا میں ہی میڈم کو یاد کر لوں۔ایسی بات نہیں ہے یار! بس یہ نوکری، گھر کے کام پھر تین بچے ان سب سے ہی فرصت نہیں ملتی۔ورنہ یاد تو بہت کرتی ہوں اسکول کے سبھی لوگوں کو۔تمھارے ساتھ گزارے ہوئے وہ پانچ سال تو سچ مچ بہت یاد آتے ہیں۔جب یاد کرتی ہوں تو کبھی کبھی بات ملاقات کے لیے بھی وقت نکال لیا کرو۔ماہی نے بیچ میں ہی ٹوکا۔بلکہ ایسا کرو آج دوپہر کے کھانے کے بعد sec-10 کے پارک میں آجاؤ۔وہیں دھوپ میں بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔نیتو نے معذرت کرتے ہوئے کہا آج تو لیکن نہیں اگلے ہفتے دیکھتی ہوں۔دیکھتی ہوں نہیں اگلے اتوار ہم مل رہے ہیں بس۔ٹھیک ہے ٹھیک ہے، چلو بائی کہتے ہوئے نیتو نے فون کٹ کر دیا۔

اگلے اتوار کو ٹھیک تین بجے ماہی پارک پہنچ چکی تھی۔اس کی نظریں بار بار انٹرنس گیٹ کی جانب اٹھ جاتیں۔انتظار کی گھڑی واقعی بہت طویل ہوتی ہے جو گزارے نہیں گزرتی۔اس نے فون میں ٹائم دیکھا اور آہستہ قدموں سے پارک کے چکر لگانے لگی۔ابھی پہلا چکر پورا ہونے ہی والا تھا کہ سامنے سے نیتو آتی دکھائی دی۔سرخ رنگ کے پلازو پر اس نے گہرے نیلے رنگ کی کرتی ڈالی تھی۔گلے میں ملٹی کلر کا پیارا سا اسکارف تھا۔خاص انداز سے تراشے ہوئے بال شانے پر کھلے پڑے تھے۔کل ملا کر اس کی شخصیت بڑی پرکشش دکھ رہی تھی۔ماہی نے دوڑ کر اسے گلے سے لگا لیا۔کچھ دیر تک دونوں باتیں کرتے ہوئے چہل قدمی کرتی رہیں، پھر خالی پڑے بینچ پر بیٹھ گئی۔اب دونوں بالکل آمنے سامنے تھیں۔ماہی نے نیتو کی آنکھوں میں جھانکا، اسے ان آنکھوں میں پھر وہی اداسی نظر آئی۔اس نے قدرے جھجکتے ہوئے پوچھا۔۔۔نیتو سب ٹھیک تو ہے نا؟ نیتو نے الٹا اسی سے سوال کر ڈالا۔۔۔کیوں؟ کیا لگتا ہے؟ کچھ گڑبڑ ہے؟ نہیں یار۔۔۔ ایسا نہیں ہے۔۔۔بس میں نے یوں ہی پوچھ لیا۔۔۔وہ تمھاری آنکھوں کی چمک۔۔۔نیتو نے بیچ میں ہی اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔۔۔کیا ہوا میری آنکھوں کی چمک کو؟ کچھ نہیں بس وہ پہلے والی بات نہیں رہی۔نیتو نے اس کی باتوں کو ان سنا کرتے ہوئے، گھڑی پر نگاہ ڈالی اور اٹھتے ہوئے کہا۔ اب مجھے چلنا چاہیے، بہت دیر ہو چکی ہے۔ماہی چپ چاپ کھڑی ہوگئی۔گیٹ پر پہنچ کر اس نے ایک بار پھر نیتو کی آنکھوں میں جھانک لیا۔اس بار نیتو نے اپنا منہ اس کے کان کے قریب لاتے ہوئے پوچھا۔۔۔ ماہی! یہ تم نے آنکھوں کے رستے دل تک پہنچنے کی کلا کب سے سیکھ لی ہے؟ ابھی وہ کچھ کہہ پاتی اس سے قبل نیتو نے بائے کہتے ہوئے تیزی سے اپنے قدم آگے بڑھا دیے۔ماہی پورے راستے اس کے بارے میں سوچتی رہی۔ آخر ان دو سالوں میں ایسا کیا ہو گیا تھا؟ اچھی خاصی تو تھی اس کی زندگی۔بہتر کمانے والا شوہر تھا، جو اپنی کمائی کی ایک ایک پائی اس کے ہاتھوں میں رکھ دیتا۔کسی طرح کی کوئی پابندی نہیں۔کہیں بھی آجا سکتی ہے۔کسی سے بھی مل جل سکتی ہے، باتیں کر سکتی ہے، جو چاہے پہن سکتی ہے، کھا سکتی ہے، جہاں چاہے گھوم سکتی ہے۔خود بھی تو ایک اچھی نوکری کرتی ہے۔بھگوان رکھے تین بچے ہیں۔پھر اسے کس بات کا دکھ، کون سی

تکلیف تھی جو اس کی آنکھیں اس طرح بجھ گئی تھیں۔ سامنے سے گزرتی موٹر سائیکل نے ماہی کو خیالوں کی دنیا سے نکال کر حقیقت کی دنیا میں پہنچا دیا۔ بال بال بچی تھی وہ۔

پینکل مال سوسائٹی سے کچھ ہی دوری پر تھا، جہاں اگلے چار دنوں کے لیے لاسٹ سیزن کا بمپر آفر چل رہا تھا۔ ماہی بے صبری سے سنیچر کا انتظار کر رہی تھی۔ اس بار دوسرا سنیچر تھا یعنی اسکول میں چھٹی۔ اس نے من ہی من پینکل جانے کا پروگرام بنا لیا تھا، مگر بیٹے کے سامنے ذکر نہیں کیا تھا ورنہ وہ کوئی کام کرنے نہ دیتا، ہر آدھے گھنٹے پر ایک ہی سوال۔۔۔ ممّا کتنا ٹائم لگے گا؟ جلدی چلو نا۔ سارے اچھے کلیکشن ختم ہو جائیں گے۔ یہی سوچ کر وہ جلدی جلدی گھر کے کام نپٹا رہی تھی کہ دوسرے کمرے میں فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ جب تک وہ فون اٹھاتی، کال مس ہو چکی تھی۔ دیکھا تو نیتو کا نمبر تھا۔ بنا ایک لمحہ گنوائے اس نے بیک کال دی۔ فون ریسیو نہ کر پانے کی معذرت چاہی اور حال چال دریافت کیا۔ رسمی گفتگو کے بعد نیتو نے پوچھا۔۔۔ آج کوئی پروگرام تو نہیں۔ نہیں۔۔۔ تم بتاؤ۔۔۔ نہیں کچھ خاص تو نہیں۔ فری ہو تو ہماری طرف آ جاؤ۔ بچے اپنے فرینڈس کے یہاں گئے ہیں۔ میں گھر پر اکیلی ہوں سوچا تمھیں بلا لوں۔ اطمینان سے باتیں کریں گے۔ کافی شکایت ہے تمھیں مجھ سے۔ ہو سکتا ہے مل بیٹھ کر بات کرنے سے دور ہو جائے۔ ماہی نے بنا کچھ سوچے حامی بھر لی۔ اسے اس بات کا خیال بھی نہ رہا کہ آج ہفتے کا آخری دن ہے اور اسے آف سیزن کی شاپنگ کے لیے جانا ہے۔

بتائے ہوئے اڈریس پر پہنچ کر ماہی نے کال بیل بجائی۔ نیتو نے ہونٹوں پر مسکراہٹ سجائے دروازہ کھولا۔ دو کمروں کا چھوٹا سا فلیٹ، جس میں نیتو اپنے تین بچوں کے ساتھ رہتی ہے۔ اس کے شوہر آسام میں نوکری کرتے ہیں۔ چھٹیوں میں ہی ان کا آنا ہوتا ہے۔ کمرے کی بے ترتیبی ماہی کو کھٹک رہی تھی۔ ابھی وہ گھر کا معائنہ کر ہی رہی تھی کہ نیتو چائے بنا کر لے آئی۔ دونوں باتیں کرتے ہوئے چائے کی چسکی لینے لگے۔ باتوں ہی باتوں میں نیتو نے پوچھا۔۔۔ ماہی! تم بھی ایک عورت ہو بتاؤ ایک عورت کو زندگی میں کیا چاہیے۔ ماہی نے سوال کو دہرایا۔۔۔ عورت کو زندگی میں کیا چاہیے؟ مطلب؟ مطلب یہ کہ اس کی زندگی کیسی ہونی چاہیے؟ بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔۔۔ بالکل ویسی ہی جیسی تمھاری ہے۔ بھگوان کا دیا سب کچھ تو ہے تمھارے پاس۔ اتنا سیدھا، سچا اور شریف شوہر ملا ہے تمھیں، پھر اب تو بچوں کی زندگی کے بارے میں ان کے مستقبل کے بارے میں سوچنے کا وقت ہے، یہ کن خیالوں میں گم ہو تم۔ کہہ تو تم سہی رہی ہو، مگر۔۔۔ ایک لمحہ رک کر نیتو نے کہنا شروع کیا۔۔۔ خود اپنی زندگی مکمل نہ ہو۔۔۔ احساسات و جذبات کا کوئی کونہ خالی رہ گیا ہو اور اس خالی پن کے پورے ہونے کی کوئی امید بھی باقی نہ رہی ہو تو جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتے بچے کی ماں کیا کرے؟ کیسے جیے وہ؟ کہاں سے لائے اپنی آنکھوں میں امیدوں کی چمک؟؟ اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گئی اور خالی کپ میں دھیرے دھیرے چمچ ہلانے لگی۔ ماہی کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ اس نے سر کھجاتے ہوئے کہا۔۔۔ یار یہ تو کس طرح کی باتیں کر رہی ہے؟ تجھے کیا ہو گیا ہے؟ پہلے تو اس طرح کی باتیں نہیں کی تو نے۔ ہاں ایسی باتیں پہلے نہیں کی، مگر اب لگتا ہے کرنی چاہیے تھی، مجھے اس طرح کی باتیں۔ کہتے ہوئے نیتو نے سائڈ ٹیبل کی دراز سے اسکیچ بک نکال کر ماہی کی جانب بڑھا دیا۔

ماہی نے بے من سے صفحات پلٹنے شروع کیے۔ مگر جیسے جیسے وہ صفحات پلٹتی گئی اس کے چہرے کے تاثرات بدلتے گئے۔ اس نے ایک ایک صفحے کو بڑے غور سے دیکھنا شروع کیا۔ پہلے صفحے میں ایک جوڑے کو اگنی کے پھیرے لیتے دکھایا گیا تھا۔ دوسرے صفحے میں کسی خوبصورت وادی سے کار گزر رہی تھی۔ کار کی پچھلی نشست پر دونوں زندگی کے جھمیلوں سے دور ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے خوبصورت مناظر سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ تیسرے صفحے میں دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے کسی پارک میں چہل قدمی کر رہے تھے۔ دونوں کے لبوں پر دلفریب مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ اگلے صفحے میں لڑکی ایک ہاتھ میں بیگ سنبھالے کسی آفس کے گیٹ پر کھڑی دوسرا ہاتھ ہلا کر گاڑی میں بیٹھے لڑکے کو بائے کہہ رہی تھی۔ اگلے صفحے میں لڑکا لڑکی کا ہاتھ تھامے تیزی سے گاڑیوں سے بھری سڑک کو پار کر رہا تھا۔ اس کے بعد والے صفحے میں لڑکی کچن میں کھڑی تھی۔ لڑکا اسے ہاتھ سے پکڑ کر باہر کی طرف نکالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ تمام صفحات پر آڑی ترچھی لکیروں سے ایسے ہی خوبصورت احساس کو ابھارا گیا تھا۔ ماہی نے سرد آہ بھرتے ہوئے اسکیچ بک بند کر دیا۔ نیتو نے ماہی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔۔۔ ماہی! ان خوبصورت احساسات کو جیے بنا آنکھوں کی چمک کا برقرار رہنا ممکن ہے کیا؟ ماہی نے خاموشی سے نیتو کے چہرے پر نظریں جما دی اور اس کی بے نور آنکھوں کے رستے دل کی گہرائی میں اترتی چلی گئی۔

Shakila Nigar
S.M.S.G College
Sherghati
Gaya-824211 (Bihar)
Mob: 7983432279
shakila84nigar@gmail.com

ڈاکٹر احسان رؤف

سن یاس خواتین کی زندگی کا ایک اہم حصہ

سن یاس کو Menopauseیا Climactrium بھی کہتے ہیں۔تولیدی زندگی(Reproductive life) کے بعد حیض (Menstruation) کا مستقل اور مکمل طور پر بند ہوجانا سن یاس یا انقطاع طمث کہلاتا ہے۔یہ وہ دور ہوتا ہے جب افزائش نسل کا سلسلہ ختم ہوجاتا ہے اور عورت ماں بننے کے قابل نہیں رہتی۔سن یاس کی عمر عام طور پر 45-55 سال ہوتی ہے،جبکہ اس کی اوسطاً عمر 50 سال ہوتی ہے۔سن یاس کی عمر کا تعلق ماہواری کے شروع ہونے کے دور، آخری حمل سے نہیں ہوتا ہے ۔جبکہ سگریٹ نوشی کرنے والی خواتین، بہت کمزور خواتین میں سن یاس وقت سے پہلے ہوسکتا ہے۔

طمث کا فعل درج ذیل طریقوں میں سے کسی ایک طریقہ پر ختم ہوسکتا ہے۔

1۔بعض اوقات 50 سال کی عمر تک طبعی حالت میں حیض جاری رہتا ہے اس کے بعد بلا کسی واضح تغیر کے اچانک حیض بند ہوجاتا ہے۔

2۔اکثر عورتوں میں حیض آہستہ آہستہ موقوف ہوتا ہے۔شروع میں ایام ماہواری کے وقفوں میں باقاعدگی آتی ہے یعنی وقفے لمبے ہوجاتے ہیں اور حیض میں خون کی مقدار گھٹتی جاتی ہے اور آخر میں ختم ہوجاتی ہے۔

3۔حیض کے ایام شروع ہونے پر خون کثرت سے خارج ہوتا ہے ،زیادہ مدت تک جاری رہتا ہے اور پھر اسی طرح حیض منقطع ہوجاتا ہے۔

اعضاء میں ہونے والے تغیرات

سن یاس میں خواتین کے مخصوص اعضاء میں مختلف قسم کے تغیرات ہوتے ہیں جو کہ درج ذیل ہیں۔

1۔مبیضین(Ovaries)

اس کو خصیۃ الرحم بھی کہتے ہیں۔مبیضین سائز میں سکڑ جاتی ہیں اور ان کا رنگ سفید ہوجاتا ہے ۔مبیضین کا Cortex حصہ پتلا ہوجاتا ہے جبکہ Medullary حصہ کے اجزاء میں اضافہ ہوجاتا ہے۔

2۔قاذفین(Fallopian tubes)

اس عضو کا سائز بھی چھوٹا ہونے لگتا ہے ۔اس کی عضلی پرت (Layer) پتلی ہوجاتی ہے ،اس میں پائے جانے والے Cilia بھی ختم ہوجاتے ہیں

3۔رحم(Uterus)

رحم کا سائز چھوٹا ہوجاتا ہے،رحم کے اندر پائے جانے والی پرت جس کو Endometrium کہتے ہیں وہ بھی پتلی ہوجاتی ہے ۔رحم سے خارج ہونے والے افرازات(Secretions) بھی کم ہوجاتے ہیں۔

4۔مہبل(Vagina)

مہبل سکڑ جاتی ہے اور اس کی Elasticity دھیرے دھیرے کم ہوتی جاتی ہے۔اور مہبل میں تعدیہ (Infection) ہونے کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔

5۔پستان(Breast)

پستان کی شحم (Fat) کم ہوجاتی ہے۔

6۔مثانہ اور پیشاب کی نلی (Bladder and Urethra)

اس میں بھی مہبل کی طرح کی تبدیلیاں ہونے لگتی ہے۔مثانہ میں اندر اسٹر کرنے والی پرت پتلی ہوجاتی ہے اور اس میں تعدیہ (Infection) اور چوٹ لگنے کے امکانات بھی بڑھ جاتے ہیں۔

سن یاس کے علامات (Menopausal symptoms)

اکثر خواتین میں حیض کے بند ہونے کے علاوہ دوسری علامات ظاہر نہیں ہوتی ہیں،لیکن کچھ خواتین میں علامات ظاہر ہوتی ہیں جو کہ درج ذیل ہیں۔

جسم میں غیر معمولی حرارت کا احساس ہوتا ہے پھر اس کے بعد کثیر مقدار میں پسینہ کا اخراج ہوتا ہے جس کو Hot flush کہتے ہیں۔اس کے علاوہ خواتین میں خفقان (گھبراہٹ)،تکان اور کمزوری کا بھی احساس ہوسکتا ہے۔سن یاس کے شروع ہونے پر خواتین میں بلڈ پریشر طبعی سے زیادہ ہوسکتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ سر درد،سانس پھولنا جیسی علامات بھی موجود ہوتی ہیں۔ایسٹروجن ہارمون کی کمی کی وجہ سے خواتین میں جماع کی خواہش بھی کم ہوسکتی ہے۔بالوں میں پتلا پن،لچک کم ہوجاتی ہے جلد میں بھی لچک کم ہوجاتی ہے اور جھریاں پڑنے لگتی ہیں۔عورتوں میں نفسیاتی تبدیلیاں (Psychological changes) بھی ہونے لگتے ہیں،اس میں بطور خاص اضطراب (Anxiety)،سر درد،نیند نہ آنا،چڑچڑا پن،اور ڈپریشن جیسی علامات پائی جاسکتی ہیں۔

سن یاس کے بعد عورتوں کی ہڈیاں کمزور ہونے لگتی ہیں جس کی وجہ سے ہڈی کے ٹوٹنے (Fracture) اور تخلخل عظام (Osteoporosis) ہونے کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔اس کے علاوہ خواتین کا وزن طبعی سے بڑھ جاتا ہے جس کو obesity کہتے ہیں اور ایسی خواتین میں امراض قلب کا خطرہ بھی کافی بڑھ جاتا ہے۔

مشاورت (Counselling)

سن یاس کے بعد کی علامت میں مبتلا ہر عورت کی بہتر طریقہ سے مشاورت (Counselling) ہونا چاہیے۔خواتین کو بتانا چاہیے کہ ظاہر ہونے والی علامات طبعی (Normal) ہیں۔اس سے خواتین کا ڈر کم ہوگا اور گھبراہٹ اور نیند کی کمی جیسی علامات بھی کم ہوجائیں گی۔

علاج (Treatment)

سن یاس کے بعد ظاہر ہونے والی علامات کا علاج دو طرح سے ہوتا ہے۔۱۔بغیر ہارمون کے علاج ۲۔ہارمون سے علاج

1۔بغیر ہارمون سے علاج

(Non Hormonal Treatmen)

☆ خواتین کو ہلکی ریاضت (Exercise) کرانے کی ہدایت دی

جائے ،سگریٹ نوشی، شراب نوشی سے پرہیز کرایا جائے ۔کیلشیم ، پروٹین سے بھرپور غذائیں دی جائے ۔مثلاً دودھ، ہری سبزیاں ،سویابین، وغیر استعمال کرنے کی ہدایت دی جائے

☆وٹامن ڈی کیلشیم کی ساتھ دیا جائے ۔اس سے ہڈی کے ٹوٹنے اور Osteoporosis کے امکانات کم ہوجاتے ہیں۔

☆بسفاسفونیٹس (Bisphosphonates) اور کیلسی ٹونن (Calcitonin) کا استعمال :ان دواؤں کا استعمال Osteoporosis سے بچنے کے لیے کیا جاتا ہے۔

2۔ہارمون سے علاج(Hormonal Treatment)

ایسی خواتین جن میں Premature ovarian failure، Gonadal dysgenesis، Surgical Menopause ہوں ان میں ہارمون سے علاج کیا جاتا ہے۔ہارمون کے ذریعہ علاج سے سن کے یاس کے بعد ہونے والی علامات میں فائدہ ہوتا ہے، Osteoporosis سے تحفظ ہوتا ہے۔

یونانی علاج

سن یاس کے بعد ہونے والی علامات کو کم کرنے کے لیے طب یونانی میں کیلشم کے مرکبات مثلاً خمیرہ صدف، کشتہ صدف، خمیرہ مروارید وغیرہ استعمال کرائے جاسکتے ہیں۔اس کے علاوہ گھبراہٹ، بے چینی کم کرنے کے لیے جوارش شاہی، خمیرہ آبریشم وغیرہ کسی رجسٹرڈ یونانی معالج کی نگرانی میں استعمال کیے جاسکتے ہیں۔

غیر طبعی سن یاس(Abnormal Menopause)

اگر سن یاس 40 سال سے پہلے ہوجائے تو اس کو Premature Menopause کہتے ہیں، اس صورت میں ہارمون سے علاج کیا جاتا ہے ۔ جبکہ سن یاس 55 سال کے بعد بھی نہ ہو تو اس کو Delayed Menopause کہتے ہیں۔

حوالہ جات (References)

1۔ ڈی سی ڈتا، ٹکسٹ بک آف گائنا کولوجی، ساتواں ایڈیشن، 2016، جے پی بردرس، میڈیکل پبلشرس، نئی دہلی، صفحہ 46۔52

2۔ ڈاکٹر محمودہ انظر، رہنمائے امراض نسواں، 2009، ادارہ کتاب الشفا، نئی دہلی، صفحہ 38۔39۔

3۔ پروفیسر ڈاکٹر احمد حسن عسکری، امراض نسوان وعلم القبالت، 2004، ادارہ کتاب الشفا، نئی دہلی، صفحہ 49۔50

4۔ اسٹینڈرڈ یونانی میڈیکل ٹرمنالوجی، سنٹرل کونسل فار ریسرچ ان یونانی میڈیسن، نئی دہلی، 2012، صفحہ 122

5۔ ڈاکٹر سید محمد عباس رضوی، نسائیات، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، ء199، صفحہ 43۔50

□□□

Dr. Ehsan Rauf

476/6C Behind Madeh Ganj

Police Chowki

Sitapur Road

Lucknow-226020 (U.P)

مراسلہ

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا رسالہ'' ماہنامہ خواتین دنیا''، نومبر 2022، نظر نواز ہوا، تمام ہی مشمولات قابل قدر اور معلومات افزا ہیں ، بطور خاص جناب محمد عامر کا مضمون صالحہ عابد حسین کی مشہور تصنیف ''سفر زندگی کے لیے سوز وساز،، صالحہ کے بے مثال اسلوب تحریر کا عکاس ہے، جس میں مرحومہ حسین کی تحریری جمالیات کے ساتھ ساتھ ان کی تہ بتہ شخصیت کے مختلف دریچے بھی وا ہوتے ہیں، جیسا کہ محمد عامر نے لکھا ہے: صالحہ عابد حسین مختلف شہروں میں صرف ایک عام عورت کی طرح نہیں رہیں، چونکہ عورتوں کو گھریلو زندگی سے زیادہ سروکار ہوتا ہے ، مگر مصداق فاطمہ کے ساتھ ایسا معاملہ نہیں تھا، بچپن سے مطالعہ کے شوق نے انھیں بہت ساری معلومات سے بہرہ وَر کر دیا تھا، یہی وجہ ہے کہ شادی کے بعد ان کا جس شہر میں بھی رہنا ہوا، اس کو انھوں نے ایک سیاح کی نگاہ سے دیکھا اور اپنے تمام تر تجربات ومشاہدات کے ساتھ لفظوں کا جامہ پہنا دیا۔

عشرت صاحبہ کا مضمون ''سلطان اختر کی تحسینی رباعیاں'' بھرپور تجزیہ کے ساتھ تحسین کے ساتھ ایک تنقیدی مضمون ہے، جس میں قلم کار دو روایتی اصطلاحوں یعنی تحسینی رباعی اور شخصی رباعی کے لطیف فرق کو اپنے حسن تحریر اور ان کی رباعیوں کی مثال کے ذریعہ بغیر کسی تکلف کے بیان کرنے میں کامیاب نظر آتی ہیں۔

اسی طرح محترمہ سفینہ اپنے قلمی شاہکار ''تنویر احمد علوی ، بحیثیت محقق ومدون،، میں استاذ الاساتذہ جناب پروفیسر علوی کی تنقید وتحقیق پر علمی بحث کرتے ہوئے موصوف کے بیش بہا کارنامے کلیات ذوق کی تحقیق وترتیب پر گفتگو میں لکھتی ہیں: تنویر احمد علوی کی تحقیق وترتیبی کام میں ایک کارنامہ،، انتخاب ذوق، کی تصحیح وترتیب ہے، تنویر احمد علوی سے قبل کلام ذوق کو متعدد محققین نے ترتیب دیا ہے، جس میں محمد حسین آزاد، اسلم پرویز، مخمور سعیدی انوار الحسن، برج موہن دتاتریہ کیفی، کالی داس گپتا رضا وغیرہ اہم ہیں، مگر اس ذیل میں تنویر احمد علوی کا کام منفرد ہے، لگتا ہے کہ واقعی بھاری بھرکم اور یہ جچے تلے الفاظ ایک نئے اسکالر کے روشن مستقبل کی ضمانت ہیں۔

اسی طرح صدف پرویز کا مضمون ''اقبال سہیل کی مثنوی نگاری'' اپنے مالہ وماعلیہ کے لحاظ سے گرہ کشا مضمون ہے، جس پر ان کو داد ملنی چاہیے۔

محترمہ'' رخسانہ جبیں کی شاعری میں نسوانی مسائل'' کے عنوان سے جناب محمد وقار صدیقی نے خواتین شاعروں کا تذکرہ کرتے ہوئے کئی ایسی قابل ذکر شاعرات کا تعارف کرایا ہے جن کو ان کے فن اور صلاحیتوں کے مطابق کوئی خاص قدر ومنزلت ومقام تا ہنوز نہ مل سکا۔

اسی کے ساتھ ایک چھوٹا سا انتخاب بھی پیش کیا ہے جس کے اکثر اشعار قاری پر اچھا تاثر چھوڑتے ہیں جیسے کہ

میں پھوٹی، اس کی پسلی سے، تو ٹیڑھی
وہ سیدھا تیر جیسا، میں کماں ہوں
اس طرح یہ دنیادار بچے جانتے ہیں
مرے قدموں میں جنت ہے کہ ماں ہوں

لیکن دوسرے شعر کے مصرعہ ثانی کو علیٰ حالہ رکھتے ہوئے اگر مصرعہ اولیٰ کو یوں کہا جائے تو شاید مضمون مفہوم زیادہ لطف بخش ہو کہ

یہ چھوٹے اور بڑے سب جانتے ہیں
مرے قدموں میں جنت ہے کہ ماں ہوں

ان کے علاوہ شمارہ ہذا میں دو افسانے بھی شامل ہیں یعنی محترمہ سلمہ صنم کا'' دیوی،، اور نزہت نبیلہ صاحبہ کا'' وفا کی تلاش،، حقیقت یہ ہے کہ بلا مبالغہ دونوں ہی افسانے بڑے جذباتی اور متاثر کن ہیں۔

بطور خاص وفا کی تلاش ، میں وطن دوستی، کے ساتھ دو دلوں کی اَن مٹ محبت، افسانے کی روح ہے، جس میں زبان کی لذت بھی ہے اور بیان کی ندرت بھی، لیکن افسانے کی روایتی سرخی اس کی ندرت کے ساتھ میل نہیں کھاتی ، میری رائے میں اس کا عنوان اگر'' جوگباس'' رکھا جاتو تو زیادہ متاثر کن ہوسکتا تھا، کہ نام بھی نیا ہے اور اردو کا قاری اس طرح ایک علاقائی مذہبی اصطلاح سے بھی متعارف ہوجائے گا۔

میری طرف سے ادارے کے کارکنان کے ساتھ تمام ہی قلم کاروں کو مبارکباد پیش ہے۔

اسی کے ساتھ ایک ضروری معروض یہ بھی ہے کہ خواتین کی دنیا کا شمارہ ہذا کسی دوست کے توسط سے نظر نواز ہوا، جبکہ، ہم نے بھی اپنی سوسائٹی، مولانا آزاد ایجوکیشنل اینڈ میڈیکل آرگنائزیشن (رجسٹرڈ)، دہلی کی لائبریری کے لیے، مارچ 2022 میں چندہ جمع کیا تھا، مگر وہ ہمارے ڈاک کے نظام کی نذر ہے اور تا ہنوز کوئی شمارہ موصول نہیں ہوسکا۔

بہر حال: شدنی شدن کو۔ خیر مختصر یہ کہ شمارہ ہذا کافی معلوماتی اور عمدہ مضامین پر مشتمل ہونے کے ساتھ کافی خوبصورت اور دیدہ زیب ہے۔

البتہ آخر میں کونسل کے ڈائرکٹر اور رسالہ کے مدیر اعلیٰ جناب ڈاکٹر شیخ عقیل احمد سے درخواست ہے کہ اگر آپ حضرات اتنی محنت اور جانفشانی کے ساتھ اپنے عمدہ رسائل' فکر وتحقیق، اردو دنیا، خواتین دنیا، بچوں کی دنیا، شائع کر رہے ہیں تو قاری اور خریداروں کو اپنے رسائل سے جوڑے رکھنے کے لیے سرکاری سطح پر محکمہ ڈاک کے نظام کی چستی اور درستگی کے لیے بھی ایک قدم اٹھائیں، احقر بھی کئی رسائل سے جڑا ہے، کسی رسالہ کا چندہ جمع کرنے سے پہلے خریدار ڈاک نظام کی خرابی کا رونا روتے ہوئے اپنی دہلیز تک رسالہ پہنچنے کی ضمانت کا مطالبہ رکھتا ہے، لہٰذا اس دشوار کن مسئلے کی جانب بھی آپ کی نگاہ التفات ہونی چاہیے۔

ایک طالب علم: ڈاکٹر راحت مظاہری، دھلی

جنرل سکریٹری مولانا آزاد ایجوکیشنل اینڈ میڈیکل آرگنائزیشن (رجسٹرڈ)،، دہلی

خواتین دنیا دسمبر کا شمارہ ملا۔

دیگر مشمولات کے علاوہ دونوں افسانے بیحد پسند آئے ۔ڈاکٹر نشان زیدی کا نیک انسان! بیوی اپنے میاں کے خیال اس کی پسند ناپسند سے ایک پل کو غافل نہیں ہوتی اور وہ شخص اپنی نیک نامی کی خاطر مسجدوں میں ہزاروں روپے کا چندہ تو دیتا ہے لیکن بیوی کی جان لیوا بیماری پر ایک روپے خرچ کرنا گوارہ نہیں کرتا۔

رنکل شرما کی ہندی کہانی پیارا سا ٹھیک کا اردو ترجمہ بھی خوبصورت لگا۔ انسان کبھی کبھی اپنی محرومیوں سے نجات یا فرار حاصل کرنے کے لیے کتنی آسانی سے کسی انجان شخص پر محض اس کی ظاہری شکل دیکھ کر یقین کر لیتا ہے اور ہوش آنے تک شکاری اپنا کام کر چکا ہوتا ہے۔

بڑے ہی شوق سے دنیا فریب دیتی ہے
بڑے ہی شوق سے ہم اعتبار کرتے ہیں

اس پر ستم یہ کہ دھوکہ کھانے کے بعد بھی ہیروئن کی آرزو ہے کہ کاش وہ ٹھگ اسے پھر کہیں مل جائے۔

سوپریا سنگھ وینا اور رچنا نرمل کی شاعرانہ کوشش اچھی لگی۔ اچھا یہ اردو رسم الخط سے واقف بھی ہیں؟ اگر ہیں تو اور بھی اچھی بات ہے۔

ریحانہ احمد، تالتلہ لین، کولکاتہ

□□□

خواتین خبرنامہ

قومی اردو کونسل میں خواتین سے متعلق کمیٹی کے زیر اہتمام
یک روزہ ورکشاپ کا انعقاد

پچھلے دنوں قومی کونسل کے صدر دفتر میں ایک روزہ ورکشاپ کا انعقاد کیا گیا۔ یہ ورکشاپ خواتین کے کام کی جگہ کو محفوظ بنانے اور خواتین کو تحفظ فراہم کرنے سے متعلق تھا۔ اس ورکشاپ میں خواتین سے متعلق بہت سے ایشوز پر اظہار خیال کیا گیا۔ پروفیسر نزہت پروین، فیکلٹی آف لا، جامعہ ملیہ اسلامیہ، بطور مقرر موجود تھیں۔ انھوں نے خواتین کے قوانین پر گفتگو کرتے ہوئے ان کو بیدار رہنے اور اپنے حقوق کے بارے میں باخبر رہنے کی طرف اشارہ کیا۔ تمام آفیسز، کالجز اور یونیورسٹیوں میں اس سے متعلق ایک کمیٹی تشکیل دی گئی ہے جو کام کی جگہوں پر خواتین کے

ساتھ برے برتاؤ یا اس قسم کی دوسری تمام شکایتوں کا حل پیش کرتی ہے۔ خواتین اگر خوف اور ہراساں محسوس کر رہی ہیں یا ان کے حقوق کی پامالی ہو رہی ہے یا ان کی شکایتوں کو نہیں سنا جا رہا ہے تو وہ ان حالات میں کمیٹی کو اطلاع کر سکتی ہیں۔

کام کی جگہ پر خواتین کی جنسی ہراسانی (روک تھام، ممانعت اور ازالے) ایکٹ، 2013 ہندوستان میں ایک قانون سازی کا ایکٹ ہے جو خواتین کو ان کے کام کی جگہ پر جنسی ہراسانی سے بچانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس بل کو 23 اپریل 2013 کو صدر کی منظوری مل گئی۔ یہ ایکٹ 9 دسمبر 2013 سے نافذ العمل ہوا۔ حکومتی سطح پر بھی خواتین کے کام کی جگہوں کو محفوظ بنانے اور خواتین کو تحفظ فراہم کرنے کے لیے کمیٹی تشکیل دی جاتی ہے۔ خواتین کے تحفظ کے لیے حکومت نے ایک ایکٹ بنایا ہے۔ یہ ایکٹ جائے کار خواتین کی جنسی اذیت دہی (انسداد، ممانعت اور دادرسی) کہلاتا ہے۔ ہندوستانی حکومت نے 2013 میں خواتین اور لڑکیوں کی زندگی بہتر بنانے کے لیے کچھ مثبت اقدام کیے۔

کام کی جگہ پر خواتین کو جنسی طور پر ہراساں کیے جانے کے خلاف تحفظ فراہم کرنے اور جنسی ہراسانی کی شکایات کی روک تھام اور ازالے کے لیے اور اس سے متعلق معاملات کے لیے اس ایکٹ کو تشکیل دیا گیا۔ جب کہ جنسی طور پر ہراساں کرنے کے نتیجے میں آئین ہند کے آرٹیکل 14 اور 15 کے تحت عورت کے برابری کے بنیادی حقوق اور آئین کے آرٹیکل 21 کے تحت اس کے جینے اور عزت کے ساتھ جینے کے حق اور کسی بھی پیشے پر عمل کرنے یا لے جانے کے حق کی خلاف ورزی ہوتی ہے۔ کسی بھی پیشے، تجارت یا کاروبار پر جس میں جنسی ہراسانی سے پاک محفوظ ماحول کا حق شامل ہے۔ جنسی ہراسانی کے خلاف تحفظ اور وقار کے ساتھ کام کرنے کے حق کو بین الاقوامی کنونشنز اور آلات جیسے کہ خواتین کے خلاف ہر طرح کے امتیازی سلوک کے خاتمے کے کنونشن کے ذریعہ عالمی طور پر تسلیم شدہ انسانی حقوق ہیں، جس کی توثیق 25 جون 1993 کو کی گئی ہے۔

جسٹس ورما کمیٹی (جسے بھارتی حکومت نے خواتین کے خلاف جرائم سے نمٹنے کے لیے بھارتی اداروں کی اہلیت کا جائزہ لینے کے لیے تشکیل دیا تھا) کی سفارشات کے بعد بھارتی پارلیمنٹ نے کرمنل لاء بل منظور کیا جس کا مقصد خواتین کے خلاف پر تشدد جرائم پر بھارتی قوانین کو مستحکم بنانا ہے۔ بل ان عوامی اہلکاروں کو سزائیں دیتا ہے جو جنسی جرائم کے سلسلے میں اپنے فرائض انجام دینے میں ناکام رہے، اس بل میں تیزاب پھینکنے، پیچھا کرنے، دست درازی کرنے اور بری نظروں سے تاڑنے کے باب میں نئی سزائیں رکھی گئی ہیں۔

پروفیسر نزہت پروین نے کمیٹی کو وقت وقت پر سینیٹائز کرنے کی بات کہی اور اپنے آفس کے ماحول کو بہتر بنانے کی طرف بھی اشارہ کیا۔ انھوں نے کام کی جگہ کو موثر بنانے پر زور دیا اور لوگوں سے اس بارے میں مشورہ کی بھی اپیل کی۔ اس موقع پر ڈائرکٹر قومی کونسل پروفیسر عقیل احمد، اسسٹنٹ ڈائرکٹر ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی صاحبہ، اسسٹنٹ ڈائرکٹر ایڈمن جناب کمل سنگھ اور کونسل کا پورا عملہ موجود تھا۔

(پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 6 دسمبر 2022)

□□□

پہلی مسلم خاتون فائٹر پائلٹ بنیں گی مرزا پور کی ثانیہ مرزا، ٹی وی مکینک کی بیٹی نے رقم کی تاریخ

نئی دہلی: اتر پردیش کے مرزا پور کی بیٹی ثانیہ مرزا فضائیہ میں ہندوستان کی پہلی مسلم خاتون فائٹر پائلٹ بننے جارہی ہیں۔ ثانیہ نے این ڈی اے امتحان میں 148 واں رینک حاصل کیا ہے۔ ثانیہ دیہات کوتوالی تھانہ علاقے کے ایک چھوٹے سے گاؤں جسوور کی رہنے والی ہیں۔

ثانیہ نے گرونانک گرلز انٹر کالج مرزا پور سے 12 ویں کا امتحان پاس کیا ہے اور وہ یوپی 12 ویں بورڈ میں ڈسٹرکٹ ٹاپر رہی ہیں۔ 10 اپریل کو وہ این ڈی اے امتحان 2022 میں شامل ہوئیں۔ امتحان پاس کرنے کے بعد انھوں نے اپنے انٹرویو کی تیاری کے لیے اکیڈمی میں شمولیت اختیار کی۔ اطلاعات کے مطابق ثانیہ 27 دسمبر 2022 کو پونے میں این ڈی اے کھڑکوا سلا میں شامل ہوں گی۔

ثانیہ کے والد شاہد علی جو پیشے سے ٹی وی مکینک ہیں، نے کہا ''ثانیہ مرزا ملک کی پہلی فائٹر پائلٹ اونی چترویدی کو اپنا آئیڈیل مانتی ہیں۔ وہ شروع سے ہی ان جیسا بننا چاہتی تھیں۔ ثانیہ ملک کی دوسری ایسی لڑکی ہے، جسے فائٹر پائلٹ کے طور پر منتخب کیا گیا ہے۔''

ثانیہ کی والدہ تبسم مرزا نے کہا ''ہماری بیٹی نے ہمارا اور پورے گاؤں کا سر فخر سے بلند کر دیا ہے۔ اس نے فائٹر پائلٹ بننے کے اپنے خواب کو پورا کر کے اپنے گاؤں کی ہر لڑکی کو متاثر کیا ہے۔'' ثانیہ مرزا ملک کی دوسری ایسی لڑکی ہیں، جنھیں فائٹر پائلٹ کے طور پر منتخب کیا گیا ہے۔ ثانیہ پہلی بار یہ امتحان پاس نہیں کر سکی تھیں اس لیے انھوں نے دوبارہ امتحان دیا۔

ثانیہ نے کہا کہ وہ ہمیشہ سے فائٹر پائلٹ بننا چاہتی تھیں۔ ثانیہ کی تحریک کا ذریعہ اونی چترویدی ہیں، جو ملک کی پہلی خاتون پائلٹ ہیں۔ وہ شروع سے ہی ان جیسا بننا چاہتی تھیں۔

خیال رہے کہ نیشنل ڈیفنس اکیڈمی 2022 کے امتحان میں مردوں اور خواتین کے لیے کل 400 سیٹیں تھیں، جن میں 19 سیٹیں خواتین کے لیے تھیں۔ ساتھ ہی ان میں سے دو نشستیں فائٹر پائلٹس کے لیے مختص

تھیں۔ ثانیہ مرزا نے ان دو میں سے ایک سیٹ حاصل کی ہے۔

(قومی آواز بیورو، 10 دسمبر 2022)

بیٹیوں کو اعلیٰ تعلیم دلائیں: جھارکھنڈ پبلک سروس کمیشن کی ٹاپر نصرت نور کی اپیل

بیٹیوں کو اعلیٰ تعلیم دلائیں ۔۔۔ ان کی زندگی کو خانہ داری تک محدود نہ رکھیں ۔۔۔ لڑکیوں کی تعلیم وقت کی ضرورت ہے ۔۔۔ لڑکیاں پڑھیں گی تو قوم اور ملک کی ترقی ہوگی۔

انھوں نے نہ صرف جھارکھنڈ پبلک سروس کمیشن (جے پی ایس سی) کا امتحان پاس کیا بلکہ کامیاب امیدواروں کی فہرست میں سب سے زیادہ رینک بھی حاصل کی جس کے نتیجے کا دو دن پہلے اعلان کیا گیا تھا۔ جھارکھنڈ کی اس خبر نے ایک بار پھر ملک بھر میں خوشی کی لہر دوڑا دی ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ نصرت نور شادی شدہ ہیں اور ان کے اس مشن میں اہل سسرال کی مکمل حمایت حاصل تھی۔

آپ کو بتادیں کہ نصرت نور کے شوہر محمد عمر بھی ڈاکٹر اور کنسلٹنٹ سرجن ہیں۔ والد محمد نور عالم جمشید پور کے ٹاٹا سٹیل میں مینیجر کے عہدے پر

ہیں جبکہ والدہ سیرت فاطمہ گھریلو خاتون ہیں۔ وہ اپنے خاندان میں سب سے چھوٹی ہیں۔ ان کے بڑے بھائی، محمد فیصل نور، نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی، جمشید پور میں صنعتی انجینئرنگ میں اپنی تحقیق کر رہے ہیں۔ وہ کہتے ہیں ہمیں اس کے انتخاب کے بارے میں کافی یقین تھا لیکن اس کے پہلے نمبر پر آنے کی خبر الحمدللہ، ایک خوشگوار حیرت تھی۔

نتیجے کی فکر کیے بغیر پہل کریں

نصرت نور کا کہنا ہے کہ مسلم خواتین کو بااختیار بننے کے لیے پہل اور کوشش کرنی چاہیے، نتیجے کے بارے میں سوچے بغیر جدوجہد کریں۔ مسلم خواتین کو سول سروسز میں آنے کے لیے آگے آنا چاہیے۔ اس طرح ہم اپنی نمائندگی کو بڑھا سکتے ہیں اور اپنی برادری اور قوم کو بڑے پیمانے پر فائدہ پہنچا سکتے ہیں۔

ایک چیز جسے وہ اپنے اسکول کے دنوں سے لے کر ڈاکٹر اور جے پی ایس سی کو کریک کرنے تک کے اپنے پورے سفر میں کبھی نہیں بھولیں گی، وہ یہ ہے کہ 21ویں صدی میں بھی لوگ اور معاشرہ عورت کو اپنے کیریئر کے بارے میں نہیں سوچنے دیتا تاکہ وہ ایک ذاتی کامیابی حاصل کر سکے۔ معاشرہ اب بھی اس بات پر یقین رکھتا ہے کہ عورت کی فلاح و بہبود ایک گھریلو ساز کے طور پر اس کے روایتی کردار میں مضمر ہے۔

بیٹیوں کو اعلیٰ تعلیم دلائیں

سول سروسیز میں قسمت آزمانے کی ترغیب کے بارے میں ان کا کہنا ہے کہ سرکاری سطح پر مسلم خواتین کی نمائندگی نہ ہونے کے برابر ہے۔ اب وقت آ گیا ہے کہ مسلمان اعلیٰ تعلیم یافتہ ہوں۔ خاص طور پر ہماری خواتین کو اس وقت سب سے آگے ہونا چاہیے جب بات ہر شعبے سے ہمارے راستے میں آنے والے مواقع کو حاصل کرنے کی ہو۔

خواتین کو مرکزی دھارے میں آنے کے لیے زیادہ سے زیادہ حصہ لینا چاہیے۔ میں خاندانوں سے بھی اپیل کرتی ہوں کہ وہ اپنی بیٹیوں کو زیادہ سے زیادہ تعلیم دلانے کی ترغیب دیں، کیونکہ یہ انھیں معاشی طور پر خودمختار اور سماجی طور پر خودکفیل بنانے کا واحد طریقہ ہے۔

اہل خاندان کا سہارا

پورے سفر میں وہ ہمیشہ میرے ساتھ رہے ہیں۔ میرے شوہر نے ہمیشہ میری حوصلہ افزائی کی ہے۔ انھوں نے گھر کے کاموں میں میری مدد کی۔ اس نے مجھے اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش کی، میرے لیے پڑھائی کا ٹائم ٹیبل ترتیب دینے سے لے کر ہمارے دو سالہ بچے کی دیکھ بھال تک۔

میرے شوہر اور سسرال والے بہت حوصلہ افزا اور معاون ہیں، میں ایک طرح سے خوش قسمت ہوں، لیکن ہر گھر میں ایسا ہونا چاہیے۔ میں کہوں گی کہ میرا خاندان ہر دوسرے خاندان کے لیے ایک رول ماڈل ہے جو اپنی بہو کے ساتھ مثالی سلوک کرتا ہے۔

وہ اپنے 10 سے زائد ارکان پر مشتمل خاندان کو اپنی طاقت اور ریڑھ کی ہڈی کے طور پر دیکھتی ہیں۔ میرا ایک بہت بڑا خاندان ہے لیکن جو کچھ میں کرنا چاہتی تھی اسے کرنے میں کبھی کوئی رکاوٹ نہیں آئی۔

جمشید پور کی نور

جھارکھنڈ کے جمشید پور میں پلی بڑھی نصرت نور، ایک بچے کی ماں ہیں، وہ ایک طبی ماہرہ ہیں جو نیورولوجی میں مہارت رکھتی ہیں۔ جمشید پور کے سیکرڈ ہارٹ کانوینٹ اسکول میں اپنی پرائمری تعلیم مکمل کرنے کے بعد، وہ راجندر انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل سائنس سے میڈیکل سائنس میں ڈگری حاصل کرنے کے لیے رانچی چلی گئی تھیں۔ اس نے سال 2020 میں اپنی ایم بی بی ایس کی ڈگری مکمل کی، اور اس کے نتیجے میں، اسے اسی میڈیکل کالج میں پریکٹس کرنے کے لیے تعینات کیا گیا جسے وہ جونیئر ریذیڈنٹ شپ کہتے ہیں۔ اس دوران ان کی شادی ہو گئی۔ لیکن اس کی شادی اس کی پڑھائی اور اپنے مقاصد کے حصول کے لیے اس کی لگن کے راستے میں نہیں آئی۔ وہ ایک مشترکہ خاندان میں رہتی ہیں، وہ کہتی ہیں، ہر کوئی بہت حمایت کرتا ہے۔ اس کے سسرال والوں نے اسے اپنے خوابوں اور مقاصد کے حصول سے کبھی حوصلہ شکنی نہیں کی۔

(آواز دی وائس، 12 دسمبر 2022)

□□□

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

کلیات رشید احمد صدیقی جلد 8 (مضامین)

ترتیب وتدوین: ابوالکلام قاسمی

پہلی اشاعت: 2022

صفحات: 510

قیمت: 235 روپے

عہد وسطیٰ کا ہندوستان (حصہ اوّل)

مصنف: ستیش چندر

مترجم: سید محمد عزیز الدین حسین

دوسری طباعت: 2022

صفحات: 348، قیمت: 170 روپے

حالی کی نظمیں

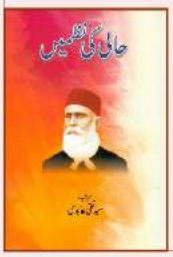

مرتب: سید تقی عابدی

پہلی اشاعت: 2022

صفحات: 66+262

قیمت: 160 روپے

کلیات راجندر سنگھ بیدی (جلد اول)

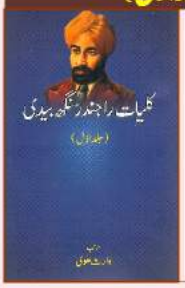

مرتب: وارث علوی

دوسری اشاعت: 2022

صفحات: 970

قیمت: 425 روپے

اردو ڈراما: تاریخ و تجزیہ

مصنف: محمد کاظم

پہلی اشاعت: : 2022

صفحات: 686

قیمت: 300 روپے

نظری تنقید: مسائل و مباحث

مرتبہ: عفت آرا

دوسری اشاعت: 2022

صفحات: 233

قیمت: 125 روپے

تشریح البدن (جلد دوم)

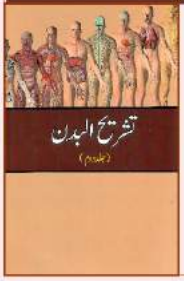

پہلی اشاعت: 2022

صفحات: 460

قیمت: 215 روپے

تاریخ طب یونانی (جلد اول)

پہلی اشاعت: 2022

صفحات: 448

قیمت: 220 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail: books@ncpul.in

माहनामा ख्वातीन दुनिया मासिक, जनवरी - २०२३ वर्ष:७, अंक: १
Mahnama Khawateen Duniya Monthly January 2023, Vol.7, Issue:1
National Council for Promotion of Urdu Language
Ministry of Education, Department of Higher Education, Government of India

RNI. No. DELURD/2017/74026
DL (S)-17/3555/2021-23
ISSN 2581-4826
Date of Publication: 13-01-2023
Date of Dispatch : 14 and 15 of every month
Total Pages: 64

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

اردو زبان و ادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

منگانے کے لیے رابطہ کریں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.: sales@ncpul.in

Printed and Published by Dr. Aquil Ahmad, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 Institutional Area Jasola New Delhi-110025
LPCDELHI,DELHIPSO,DELHIRMS,DELHI-6